محمد حسین آزاد

حیات
شخصیت
فن

آغا سلمان باقر

2063

تاریخی کتابیں

تزکِ بابری	ترجمہ: رشید اختر ندوی
تزکِ تیموری	ترجمہ: ابو ہاشم ندوی
تزکِ جہانگیری	ترجمہ: مولوی احمد علی صاحب
ہمایوں نامہ	ترجمہ: رشید اختر ندوی
شاہ جہان نامہ	ترجمہ و تلخیص: ممتاز لیاقت
احمد شاہ دُرّانی	سید نصیر احمد جامی
کالا پانی	مولانا جعفر تھانیسری
سیدان بادشاہ گر	ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر سید صفدر حسین
ادینہ بیگ	ریاض جاوید
تاریخ قبطی (تاریخ آل تیمور)	نور شاہ بن ضیاء الحسن
پانی پت کی آخری جنگ	احمد شجاع پاشا
سلطان محمود غزنوی	یقین الدین
مسلمان سسلی میں	سید نصیر احمد جامی
ابوریحان البیرونی	ادارہ تصنیف و تالیف
نشانِ حیدر	عاصم محمود
حضرت بو علی قلندر	اقبال صلاح الدین
سوانح مولانا روم	شبلی
حضرت مجدد الف ثانی	نظام الدین توکلی
حضرت پیر سید علی ہمدانی	ڈاکٹر محمد ریاض

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

کھیڑاوار سوسائٹی لائبریری
کتاب کی حفاظت کریں

محمد حسین آزاد

حیات

شخصیت

فن

تحریر: ——— آغا سلمان باقر

آزاد کے پوتے

سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

Rashid Ashraf

zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

May 2015

طبع اوّل : ستمبر ۱۹۸۱ء

ناشر : نیاز احمد

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

قیمت : بارہ روپے

مطبع وصی حیدر پرنٹر لاہور

پیش لفظ

محمد حسین آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے

دسمبر ۱۹۳۶ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا سالانہ جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں شرکت کی غرض سے میرے والد آغا محمد باقر مرحوم حضرت علامہ اقبالؒ اور پروفیسر محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور سے شریک ہوئے۔ اس جلسے میں علامہ اقبالؒ نے میرے والد سے فرمائش کی کہ وہ مولانا آزاد کی باقاعدہ سوانح لکھیں۔ وہ سوانح عمری آزاد کی زندگی کا ایک مختصر ترین خاکہ تھی۔

میں نے اس سوانح کو ہر طرح سے مکمل انداز میں پیش کرنے کی ادنیٰ کوشش کی ہے، جامع اور مختصر۔ میں نے اس میں اپنے گھرانے کی اُن روایات اور واقعات کو بھی شامل کیا ہے، جو مجھے میری والدہ اور والد مرحوم نے سنائے تھے، مگر آج تک ضبطِ تحریر میں نہ آسکے تھے، تمام تاریخی حقائق کو بھی اس سوانح میں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ خاص طور پر جن دستاویزات کا ذکر اور قلمی و غیر قلمی کتب کا تذکرہ اس سوانح میں آیا ہے، وہ میرے پاس محفوظ ہیں اور اُن سے اس کتاب کے سلسلہ میں باقاعدہ استفادہ کیا گیا ہے۔ جس کے باعث یہ کتاب جہاں اہلِ علم کیلئے

مفید ثابت ہوگی، وہاں یہ ایف، اے یا بی، اے اور ایم، اے کے طلبا و طالبات کے لئے بھی آزاد کی شخصیت اور فن کے تعارفی خاکے کی حیثیت سے مفید ہوگی۔

آخر میں میں نیاز صاحب کا ممنون ہوں کہ وہ کلاسیکی ادبا کی سوانح عمریاں اس انداز میں شائع کر کے ادب پر احسان کریں گے۔ یہ سب انہی کا مرہونِ منت ہے۔

۴۱-بی-جعفریہ کالونی
بند روڈ-لاہور

مخلص
آغا سلمان باقر

اپنے والد مرحوم آغا محمد باقر کے نام
کہ جن کی شفقتوں کا سایہ
وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا!

فہرست

پیش لفظ — آغا سلمان باقر

حیات :- ۱- آزاد اور اُن کا خاندان۔
۲- ۱۸۵۷ء کے حالات اور خانوادۂ آزاد
۳- آزاد کا بچپن
۴- نیا دور اور نئی زندگی ۱۸۵۷ء کے بعد
۵- سنٹرل ایشیا کا سیاسی سفر
۶- آزاد اور انجمنِ پنجاب
۷- آزاد اور گورنمنٹ کالج لاہور
۸- جدید نظم کی بنیاد اور آزاد
۹- آبِ حیات اور اورنٹیل کالج ۱۸۸۵ء تا ۱۸۸۵ء
۱۰- سیرِ ایران
۱۱- ملازمت کا آخری دور اور شمس العلماء کا خطاب
۱۲- آزاد کا عالمِ وارفتگی

۱۳- آزاد کی وفات، ۱۹۱۰ء

شخصیت :- ۱۴- آزاد کی شخصیت

فن :- ۱۵- آزاد کا فن

تصانیف :- ۱۶- آزاد کی تصانیف

۱۷- حوالہ جات اور تالیفات

آزاد اور اُن کا خاندان

ایک ایرانی عالم اخوند محمد عاشورا الہمدانی پندرھویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر ہمدان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، ان کا شجرۂ نسب عظیم صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سلمان فارسی سے ملتا ہے، یہ لوگ کشمیر میں آکر آباد ہوئے۔ اخوند محمد عاشورا الہمدانی کے فرزند مولانا محمد شکوہ تھے جو شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے شاہ جہاں آباد دہلی آکر بس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد شکوہ بھی اپنے والد کی طرح علوم دینیہ میں ماہر تھے، علوم متداولہ میں مکمل دست گاہ رکھتے تھے اور علوم مذہبی کی اسناد بھی اُن کے پاس تھیں۔ اس عہد کے دستور کے مطابق اُن کا وظیفہ دربار سے مقرر ہوگیا اور وہ اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے پھر اسی طرح خاندانی روایت کے مطابق مولانا محمد شکوہ نے اپنے بیٹے محمد اشرف کو بھی علوم دین کی خود تعلیم دی اور اُن کے انتقال کے بعد مولانا محمد اشرف اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ مولانا اشرف کی شادی خاندانی روایت کے مطابق ایران میں ہوئی۔ مولانا اشرف نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا اور

اپنے بیٹے محمد اکبر کی شادی ایران میں کی۔ مولانا اکبر بھی دینی عالم اور مجتہد تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اُردو ٹھیک طرح سے نہیں بول سکتے تھے لیکن اُن کے فرزند مولانا محمد باقر نے شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا اُردو اخبار دہلی اُردو اخبار جاری کیا اور اُردو زبان کو بامِ عروج پہ پہنچانے میں وہ کردار ادا کیا جو ناقابلِ فراموش ہے۔ اور پھر مولوی محمد باقر کے فرزند ارجمند مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو ادب کو ایک نئی ادبی جنت عطا کی، جو اَبدی اور لازوال ہے۔ آزاد ۱۸۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ استاد ذوق نے آزاد کی تاریخ پیدائش "ظہورِ اقبال" کہی۔ جو بعد میں واقعی اَدب کے لئے ظہورِ اقبال کا درجہ حاصل کر گئی۔

مولوی محمد باقر اپنے دَور کی ایک مشہور معروف شخصیت تھے۔ اُن کا براہِ راست تعلق بہادر شاہ ظفر سے تھا۔ استاد ذوق اُن کے بہت خاص دوستوں میں سے تھے۔ مولوی محمد باقر کی پیدائش اٹھارویں صدی کے پہلے عشرے میں ہوئی۔ سرسید کے خاندان سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ اِس سلسلے میں سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ :-

"مولوی محمد حسین آزاد صاحب سے اور میرے خاندان سے ایک ربطِ خاص ہے۔ اُن کے دادا اور میرے والد میں ایسی دوستی تھی کہ لوگ بھائی بھائی سمجھتے تھے اور اُن کے والد محمد باقر صاحب کو مجھ سے اور میرے بھائی مرحوم سے بہ سبب ہم عمری کے ایسا ہی ارتباط تھا۔"[۱]

مولوی محمد باقر نے ابتدائی تعلیم اپنی خاندانی روایت کے مطابق اپنے والد مولانا محمد اکبر سے حاصل کی، اور پھر میاں عبدالرزاق کے درس میں شرکت کرنے لگے۔ میاں صاحب دہلی کے مشہور عالمِ دین تھے۔ اسی مجلسِ درس میں استاد ذوق بھی شاگرد کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہیں مولوی محمد باقر کی ملاقات اُستاد ذوق سے ہوئی اور دونوں میں دوستی مضبوط ہونے لگی۔ اور آگے چل کر یہ دونوں دوست علم اور عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ مولانا آزاد نے اِس دوستی کا جو نقشہ آبِ حیات میں کھینچا ہے، وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ لکھتے ہیں :-

"کیا مبارک زمانہ ہوگا جب شیخ مغفور اور میرے والد مرحوم ہم عمر ہوں گے۔ تحصیلِ علم اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہوگی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی۔ اور ایک استاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔"[۲]

مولوی عبدالرزاق کے درس سے فارغ ہو کر مولوی محمد باقر دلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں جدید تعلیم حاصل کی۔ یہ تعلیمی ادارہ اس زمانے میں زندگی کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی محمد باقر دلی کالج میں ہی مدرس ہو گئے۔ آغا محمد باقر کے بقول یہ درس و تدریس کا سلسلہ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۳ء تک جاری رہا۔ ۱۸۳۱ء میں جب لارڈ ولیم بنٹنگ

نے کالج کا معائنہ کیا تو مولانا محمد باقر کے اندازِ تدریس سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں خلعت عطا کی۔ اس کے بعد مولوی محمد باقر کلکٹر ہو گئے اور پھر نائب سررشتہ، منصرم پرتال سررشتہ بندوبست، سپرنٹنڈنٹ محکمہ مال اور آخر میں تحصیلدار ہو گئے۔ لیکن ان کا نام تحصیلداری کی وجہ سے زندہ نہیں ہے۔ انھیں بقائے دوام سے ہمکنار کرنے والا شمالی ہندوستان کا پہلا اُردو اخبار ہے۔ جس کا نام "دہلی اُردو اخبار" تھا۔ یہی وہ اخبار ہے جس نے اُردو صحافت کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم کی اور مولوی محمد باقر خود ہندوستان کے پہلے باضابطہ اور باقاعدہ اُردو صحافی ہیں۔ وہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد اور شہید بھی ہیں۔ ایسی ہی گود اور گھرانے سے تربیت پانے کے بعد جو فرزندِ ادب کے آسمان کا لازوال ستارہ بن کے چمکا، اس کا نام محمد حسین آزاد ہے۔

دہلی اُردو اخبار کی بنیاد ۱۸۳۶ء میں دہلی میں رکھی گئی۔ اُس وقت مولوی محمد باقر تحصیلدار تھے۔ چونکہ مولوی محمد باقر ملازم تھے، اس لئے وہ اس اخبار سے اپنا براہِ راست تعلق ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اس اخبار کا تمام ادارتی کام مولانا آزاد کے سپرد تھا۔ مولانا محمد باقر آزاد خیال، وسیع النظر، خوددار، حق گو اور بے باک اخبار نویس تھے۔ انھوں نے صحافت کا بلند معیار قائم کیا تھا اور وہ مرتے دم تک اُس پر قائم رہے۔ اُنھوں نے اُردو میں سادہ اور بے تکلف زبان کو رواج دیا، جس پر جدید اُردو صحافت کی بنیادیں مستحکم ہوئی ہیں۔

دہلی اُردو اخبار کے ساتھ ساتھ مولوی محمد باقر نے اسلام کی ترقی اور ترویج کے لئے ایک اور اخبار "مظہرِ حق" کے نام سے بھی جاری کیا۔ یہ اخبار ۱۸۴۳ء میں جاری کیا گیا۔

مولوی محمد باقر نے اخباری صحافت کو کامیاب بنانے کے لئے ایک پریس بھی خرید لیا تھا، جہاں پر اخبار کے علاوہ کتابیں بھی چھاپی جاتی تھیں۔ یہ پریس اُنھوں نے دہلی کالج سے خریدا تھا۔ اُردو اخبار کی اشاعت کے لئے پریس کا ہونا ضروری تھا۔ مولوی محمد باقر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ وہ مذہبی مناقشہ ہے جو ان کے اور قاری جعفر علی کے مابین رہا۔ اس مناقشے کے باعث دلّی میں دو گروہ پیدا ہوئے جو باقری اور جعفری کہلائے۔ یہ مناقشہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۷ء تک زور و شور سے جاری رہا۔

قاری جعفر علی مولانا محمد باقر اور ان کے والد مولانا محمد اکبر کے شاگرد تھے۔ پہلے اجتہاد کا درجہ محض مولوی محمد باقر کے خاندان سے مختص تھا لیکن قاری جعفر علی کے دہلی قیام کرنے سے یہ قدیمی اعزاز منقسم ہو گیا۔ اس کی وجہ سیاسی ہے۔ یہ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نواب حامد علی خاں نے تقریباً بیس ہزار روپیہ نذرانہ دیکر سلطنتِ مغلیہ کی مختاری کا عہدہ حاصل کیا۔ اب اُنھیں اپنی پارٹی کو تقویت دینے کے لئے ایک عالمِ دین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قاری جعفر علی نواب صاحب کے ایما اور سفارش پر مولانا محمد اکبر کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ اور ضروری اسناد

حاصل کیں۔ نواب صاحب نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اُن کو مولوی باقر کے مقابل لا کھڑا کیا۔

اگرچہ اِن کے طرف داروں کے بے جا اعتراضوں سے اکثر جھگڑے فساد ہو جاتے تھے۔ لیکن مولوی محمد باقر اور قاری جعفر علی ہمیشہ بہت محبت اور خلوص سے ملتے تھے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا تھا۔ مولوی محمد باقر کو اگر ایک طرف اپنے قابل باپ کے جانشین ہونے کا فخر تھا تو دوسری طرف اُن کی ذاتی قابلیت بھی شاگردوں سے کم نہیں تھی۔ مگر اس کے برعکس قاری جعفر علی کی شخصیت نواب حامد علی خاں کے سیاسی دبدبے کی مرہونِ احسان تھی۔ کیونکہ نواب صاحب سلطنتِ مغلیہ کے مختارِ کُل تھے۔

اِن دونوں گروہوں کی مخالفت بڑھتی گئی۔ چنانچہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک روز رات کی تاریکی میں کسی تاریک دل جعفری نے مولوی محمد باقر کے مکان کی ڈیوڑھی پر آکر دستک دی۔ ڈیوڑھی میں کڑوے تیل کا چراغ روشن تھا۔ جس کو اُس نے بجھا دیا۔ جونہی مولوی محمد باقر نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، اُس نامعلوم دشمن نے چھرے سے حملہ کر دیا۔ مولوی محمد باقر شدید زخمی ہو گئے اور بڑی مشکل سے اُن کے زخم مندمل ہوئے۔ اِس حادثے سے جعفری اور باقری کے درمیان کشیدگی اور بڑھ گئی۔

کہا جاتا ہے کہ باقری گروہ تعداد میں زیادہ تھا۔ لیکن یہ لوگ بدترین حالات

میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ اُن کے قائد مولوی محمد باقر کی تعلیم کا اثر تھا۔ آہستہ آہستہ یہ جھگڑا خود بخود ختم ہو گیا۔

مولانا محمد باقر کے سوچنے کا انداز اُس زمانے میں عام لوگوں کی نسبت خاصہ مختلف اور ترقی پسندانہ تھا۔ انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے مشورہ سے ایک نیلام گھر بنوایا۔ شمالی ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا۔ اِس میں دُور دراز کے تاجر اپنا مال لے کر آتے اور سجایا جاتا اور پھر اُس کا نیلام ہوتا۔ یہاں بڑے بڑے رؤسا تک آتے تھے ـــــ انھوں نے اپنے محلّہ میں ایک امام باڑہ بھی بنوایا۔ استاد ذوق نے امام بڑے کی تاریخ کہی۔ ع

ع تعزیت گاہِ امامِ دارین

اِس امام باڑے کی نسبت سے مولوی محمد باقر امام باڑے والے کے نام سے مشہور تھے۔ یہ امام باڑہ اب بھی موجود ہے۔ یہ مکان کے ساتھ ہی تھا۔ اُن کا مکان دہلی میں کشمیری دروازے کے علاقے میں تھا۔

مولوی محمد باقر کے استاد ذوق کے ساتھ گہرے تعلقات تھے، دونوں ہم مکتب بھی تھے اور زندگی بھر ایک دوسرے کے شریکِ کار بھی رہے۔ استاد اپنا تمام کلام مولوی باقر کے پاس ہی جمع کرتے تھے۔ مولوی محمد باقر کے ایک اور دوست دہلی کالج کے پرنسپل فرانسس ٹیلر بھی تھے۔ عام روایات کے مطابق مولانا محمد باقر کا دردناک انجام پرنسپل ٹیلر کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس کالج کا پرنسپل بھی انگریز تھا۔ مسٹر فرانسس ٹیلر کو اتفاق سے اس حملہ کی پہلے سے خبر ہوگئی۔ وہ وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگے اور سیدھے آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے پاس چھپتے چھپاتے پہنچ گئے۔ اس لئے کہ وہی اُن کے قابلِ اعتماد اور مخلص دوست تھے جن پر وہ ایسے خوفناک اور کڑے وقت میں بھروسہ کر سکتے تھے۔

چنانچہ مولوی محمد باقر نے مسٹر ٹیلر کو کئی دن اپنے گھر میں پناہ دی۔ مگر کسی نہ کسی طرح یہ راز فاش ہوگیا۔ باغیوں نے مولوی محمد باقر کے گھر کے صدر دروازے پر آکر نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ کہ فرنگی کو نکالا جائے ورنہ ہم گھر میں گھس کر اُسے خود نکال لیں گے۔ مولانا محمد باقر ان حالات میں پریشان ہوگئے۔ مسٹر ٹیلر نے مولوی محمد باقر سے خود کہا کہ مجھے یہاں سے جانے دیجئے۔ میرا یہاں سلامت رہنا مشکل نظر آتا ہے اور میری وجہ سے آپ بھی بدنام ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ایک دن علی الصباح مسٹر ٹیلر اور اُن کے ساتھی ماسٹر رام چندر جو عیسائی تھے۔ عورتوں کا لباس پہن کر گھر سے چھپتے چھپاتے نکلے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ انگریز کمپنی تک بآسانی پہنچ جائیں گے۔ جو مولانا کے گھر سے دو فرلانگ پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ ابھی یہ دونوں کچھ ہی دور گئے تھے کہ باغیوں نے ان کو پہچان لیا اور حملہ کر دیا۔ مسٹر ٹیلر کو جب جان بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو وہ مولانا محمد باقر کی مسجد کی طرف لپکے۔ مولوی محمد باقر اندر کے دروازے سے مسجد میں پہلے ہی

پہنچ چکے تھے اور وضو کر رہے تھے۔

مسٹر ٹیلر دوڑ کر ایک حجرے میں جا چھپے۔ لیکن باغی بھی برابر اُن کا پیچھا کر رہے تھے۔ مولوی محمد باقر نے اُن لوگوں کو لاکھ منع کیا کہ مسجد کی حرمت کا خیال رکھیں۔ لیکن ایسے موقع پر کون کسی کی سنتا ہے۔ مولوی محمد باقر نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کئی آدمیوں کو آذان دینے کو کہا۔ فسادیوں نے آذان کے احترام کو بھی ملحوظ نہ رکھا اور مسٹر ٹیلر کو لاٹھیوں سے مارنا شروع کر دیا۔ آخر ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مسجد سے باہر لے گئے اور باہر گلی میں لے جا کر قتل کر ڈالا۔ تمام لوگ تماشہ دیکھنے میں محو تھے۔ مولانا نماز پڑھ کر گھر واپس آئے اور گھر والوں کو یہ تمام واقعہ سنایا جس کو سن کر سب کے ہوش اُڑ گئے۔

۱۸۵۷ء کے آخری ہفتے میں انگریزی فوج نے دہلی کو فتح کر لیا۔ اب جبکہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا تو باغیوں کی گرفتاریوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے اُن لوگوں کو گرفتار کیا گیا، جن کا تعلق قلعہ معلیٰ سے تھا۔ یعنی مخبر نے جس کے بارے میں رپورٹ دی اُسی کو گرفتار کر لیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی محمد باقر کے بارے میں بھی مخبری ہی کی گئی تھی۔ چنانچہ ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اس سلسلے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ مسٹر ٹیلر وقتِ رخصت مولوی محمد باقر کو مدرسہ دہلی کے بارے میں کچھ کاغذات دے گئے تھے اور یہ کہہ گئے تھے کہ جب دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جائے تو یہ کاغذات افسرِ اعلیٰ کو پہنچا دیئے جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ ان کاغذات پر مسٹر ٹیلر نے لاطینی زبان میں یہ بھی لکھ دیا تھا۔ کہ اگر مولوی باقر چاہتے تو ہماری جان بھی بچا سکتے تھے۔ بہر حال اُس وقت لاطینی پڑھا لکھا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ جو اس تحریر کی تصدیق کرتا۔ مولوی محمد باقر کو اُن کے ہمدردوں نے بہت منع کیا کہ وہ کاغذات افسرِ اعلیٰ تک نہ پہنچائیں۔ لیکن اُنھوں نے کہا کہ میں مسٹر ٹیلر سے کیا ہوا وعدہ ضرور ایفا کروں گا۔ نیز مجھے پورا بھروسہ ہے کہ انھوں نے میرے خلاف کچھ نہ لکھا ہوگا۔ آخر کار وہ کاغذات انھوں نے بذاتِ خود افسرِ اعلیٰ میجر ہڈسن تک پہنچائے اور لوگوں کا کہنا درست ثابت ہوا اور مولوی محمد باقر کو اس جرم میں گرفتار کر کے گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

مولوی محمد باقر کو گرفتاری کے بعد دہلی دروازے کے باہر کھلی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے سے کثیر تعداد باغیوں کی موجود تھی اور ان سب کے لئے سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھانسی کس وقت دی جائیگی۔ یا کس وقت سب کو یکبارگی گولیوں سے اُڑا دیا جائے گا۔

مولانا محمد باقر کے گرفتار ہونے کے بعد اُن کے گھرانے میں کہرام مچ گیا۔ شہر میں الگ تباہی و بربادی کا دیو گھر گھر جھانک رہا تھا۔ آخر کار یہ انتظام کیا گیا کہ گھر میں جو کچھ بھی زر و جواہر اور زیورات وغیرہ موجود ہیں۔ انھیں یک جا کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا جائے۔ تقریباً نصف رات گزرنے پر اس صندوق کو اس کنوئیں میں پھینک دیا گیا جو مولانا کی مسجد کے صحن میں تھا۔ یہ

مسجد کھجور والی مسجد کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ غدر کے بعد حکومت نے شہر کے سب کنوئیں صاف کرائے اور اُن سے جو کچھ بھی برآمد ہوا، اُس کو داخلِ خزانہ سرکار کر دیا گیا۔ غرض اُدھر تو مولوی محمد باقر گرفتار کر لئے گئے۔ اور ادھر اُن کا آشفتہ حال کنبہ جو بائیس افراد پر مشتمل تھا۔ گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا اور دھوبی واڑے کی گلی میں بیٹھ کر شہر سے باہر نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ گھر سے نکلنے کا جو نقشہ اور آپ بیتی مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں لکھی ہے وہ انتہائی کرب ناک ہے لکھتے ہیں:-

"فتح یاب لشکر کے جوان اور بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیرا تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا اٹھا کر لے چلوں۔" [۳]

مولانا آزاد نے بھرے گھر میں سے اگر کوئی چیز اٹھائی تو وہ اپنے استاد کی غزلوں اور کلام کا بستہ تھا۔ حقِ استاد تو یہاں اس کڑے مرحلے پر ہی ادا ہو گیا۔ مگر مولانا نے آخری وقت تک حقِ استاد ادا کیا۔ جس کی مثال بہت نایاب ہے۔

اُس وقت آزاد کی عمر ۲۷ برس کی تھی۔ اُن کے ساتھ کنبے کے بائیس افراد تھے۔ ان میں آزاد کی اکلوتی بہن، اُن کی بیوی، دو صاحب زادیاں جن میں سے ایک کی عمر اُس وقت ایک سال کی تھی اور دوسری امت السکینہ چھ سات برس

کی تھی۔ بچو بھی اور اُن کی لڑکی مولانا محمد باقر کی بیگم۔ اُن کے سامنے اور بیویاں
مامائیں اور ماما کا لڑکا۔ پریس کے منتظم منشی بشیر حسین معہ بیوی اور بچے بچے۔ غرض
یہ سب کے سب تعداد میں ۲۲ تھے۔ اس لئے ہوئے قافلے کا تذکرہ آزاد نے
عالمِ وارفتگی کی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ جو بہت رقت انگیز ہے۔ "

۱۸۵۷ء کے ان واقعات کے بارے میں آزاد آبِ حیات میں دلی سے
ہجرت کا نقشہ باندھتے ہیں وہ واقعی المیہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"——— بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا کچھ
اٹھا کر لے چلوں کہ دفعتاً استاد ذوق کی غزلوں کے جُنگ پر نظر
پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی ہے تو
سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے، جو یہ غزلیں
پھر آ کر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے۔ اور ہے تو اُن پر
منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ بھی مر کر زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی باقی
نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ بچے سجائے گھر کو چھوڑ
۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ زبان سے
نکلا کہ حضرتِ آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلی بھی ایک بہشت
ہے۔ اُسی کا پوتا ہوں، دلی سے کیوں نہ نکلوں ———"

یہ آشفتہ حال قافلہ رنج و غم اور بربادی سے تباہ حال تھا۔ کہ اس

حال میں گھر سے نکل کر قریب کی ایک گلی میں بیٹھ گیا۔ یہ گلی آج بھی دھوبی
واڑے کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خانماں برباد لوگ۔ یہاں سے اکٹھے ہو کر
شہر سے باہر نکل جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ یکایک ایک گولہ زمین پر آ کر گرا
اس کے دھماکے سے مولانا آزاد کی ایک شیر خوار بچی جس کی عمر تقریباً ایک
سال کی تھی۔ دہل گئی اور اُس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ حالت کئی دن تک
رہی اور آخر وہ اِسی حال میں انتقال کر گئی۔ مولانا کو اس کی موت کا بہت
شدید صدمہ ہوا۔ جس کے نفسیاتی اور لاشعوری اثرات بہت بعد میں ظاہر
ہوئے۔ یہ قافلہ دھوبی واڑے سے روانہ ہو کر برف خانے کے چوک میں
پہنچا۔ برف خانہ جنتر منتر کے قریب واقع تھا۔ یہ لوگ مصیبتوں کے پہاڑ عبور
کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس وقت ایسے حالات تھے کہ دلی کے مہاجرین اور
بربادلوگوں کو کوئی شخص پانی پلانے کا بھی روادار نہیں تھا۔ اِس لئے کہ کہیں اس کے
باغی ہونے کا الزام نہ لگ جائے۔ اس قافلے نے درختوں کے ایک جھنڈ میں
ڈیرے ڈال دیئے اور دو دن کے بھوکے پیاسوں کو کھانے پینے کی فکر ہوئی۔
جو کچھ بھی حسنِ اتفاق سے گھر کی بیبیاں ساتھ باندھ لائی تھیں، وہی صبر و شکر کے
ساتھ کھولا گیا۔ مٹی کے ٹھیکرے میں بقول آزاد آٹا گوندھا گیا۔ پتھر جمع کر کے
چولہا بنایا گیا۔ اِدھر اُدھر سے سوکھے پتے اور ٹہنیاں جمع کیں اور آگ جلائی ٹھیکرے
ہی سے توے کا کام لیا گیا اور کچی پکی روٹیاں پکائیں۔ اُسی ٹھیکرے پر نمک

مرچ سے چٹنی پیسی گئی۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ میری والدہ (آزاد کی بہو) بیان کرتی ہیں کہ آزاد کہا کرتے تھے ——— "بیٹی! اُس لہسن کی چٹنی اور ٹھیکروں پر پکی ہوئی روٹی میں ایسا مزہ آیا کہ کبھی پلاؤ، زردے اور قورمہ بریانی میں نہیں آیا۔"

یہاں مجھ کو یہ فیصلہ ہوا کہ تمام قافلہ منشی بشیر حسین کے ساتھ سوفی پت روانہ ہو جائے۔ منشی صاحب آزاد کے والد کے چھاپے خانے کے میر منشی تھے اور اُن کے والد بھی اُن سے پہلے یہی خدمت دیانتداری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ اس لئے ان پر ہر قسم کا بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ بدقت تمام بیل گاڑیاں کرائے پر حاصل کی گئیں اور تمام سواریاں منشی صاحب کی نگرانی میں سوفی پت روانہ ہو گئیں۔ مگر آزاد، آزاد رہنا چاہتے تھے۔ اُن کو سب نے سمجھایا اور کہا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ تمھارے والد بغاوت کے الزام میں گرفتار ہیں اور زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ تم اپنی جان کو مزید خطرے میں مت ڈالو۔ لیکن اُنھوں نے کہا کہ "اللہ نگہبان ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے والد سے ضرور ملوں گا۔" آخر سب نے آزاد کو خدا حافظ کہا اور روتے دھوتے رخصت ہو گئے اور آزاد اپنے اُستاد کا کلام بغل میں دبائے واپس اُجڑے دہلی کی جانب روانہ ہو گئے جس کے سنگین حصار میں اُن کے والد زندگی کے آخری سانس گن رہے تھے اور عبادت میں مصروف تھے۔

دہلی پر انگریزی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ ہر شخص کی جان خطرے میں تھی۔ انقلاب نے لوگوں کے سوچنے کے انداز بھی تبدیل کر دیئے تھے۔ آزاد دہلی

کے گلی کوچوں میں چھپتے چھپاتے گھومتے رہے۔ ہر اُس کوچے میں گئے اور ہر اُس دروازے پر دستک دی جس میں اُن کے بچپن کے دوست یا احباب رہتے تھے، مگر سب دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن گھر اُجاڑ اور لُٹے پڑے تھے۔ آخر آزاد ایک ٹوٹی ہوئی دوکان میں چھپ کر بیٹھنے لگے۔ اُن کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ والد سے کسی طرح سے ملاقات ہو جائے۔ بہت سوچنے کے بعد آزاد کو ایک کھچ بریل کا خیال آیا، جو اُن کے والد مولانا محمد باقر کا قدیمی دوست تھا۔ آزاد نے سوچا کہ یہی ایک شخص ہے جو مجھے میرے باپ تک پہنچا سکتا ہے۔

آزاد فوراً روانہ ہو گئے اور اس کے پاس پہنچے۔ پے در پے حادثات اور انقلاب کی شدت نے آزاد جیسے حساس شخص کو ہر طرح سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ جہاں اُن کا ذہن اُس سے متاثر ہوا، وہاں اُس کے اثرات اُن کے چہرے اور جسم پر بھی نمودار ہوئے۔ اِس بگڑے ہوئے حلیے میں سردار جریل سنگھ نے آزاد کو بڑی مشکل سے پہچانا اور جب پہچان لیا تو اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ حالات معلوم کئے۔

آزاد نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ سردار جریل سنگھ نے کہا، شہر کی حالت تمھیں معلوم ہی ہے۔ تمھارا ایک لمحہ بھی یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن آزاد مصر ہے کہ میں اپنی آرزو ضرور پوری کروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے جان پر ہی کیوں نا کھیلنا پڑے۔ آخر آزاد کی لگن اور اصرار کو دیکھتے ہوئے سردار نے

حقِ دوستی ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے آزاد کو یہ مشورہ دیا کہ اپنا لباس تبدیل کرو اور میرے سائیس کا لباس پہنو۔ اس لئے کہ اپنی جان کو ان حالات میں سلامت رکھنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ آزاد نے اس پر عمل کیا۔ کہتے ہیں کہ پہلے سکھ جرنیل نے خود دہلی دروازے جا کر باغی قیدیوں کا معائنہ کیا۔ قیدی لق و دق میدان میں پڑے تھے۔ نہ اُن کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا تھا اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی۔ بھوک اور پیاس سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ ہر شخص دن کی دھوپ اور رات کی سردی سے نڈھال بلکہ نیم جان تھا۔

یہی وہ لوگ تھے، جو شاہجہاں آباد کی روحِ رواں اور رؤسا کہلاتے تھے۔ لیکن آج ناگہانی موت اور بے اندازہ آلام نے اُن کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چاروں طرف سنگین فوجی پہرہ تھا۔ سردار جرنیل سنگھ نے واپس آ کر آزاد کو ان حالات سے آگاہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے روز جرنیل سنگھ صاحب اپنے گھوڑے پر چلیں اور آزاد بحیثیت سائیس کے اُس کے ساتھ ساتھ دوڑیں اور اس طرح قیدیوں تک آسانی سے پہنچ جائیں۔

دوسرے روز اسی تجویز پر عمل ہوا۔ آزاد سائیس کا لباس پہنے جرنیل سنگھ کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے اور آخر اُس مقام پر پہنچے جہاں باغی قیدی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ کوئی بھوک پیاس سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اور بربادی کا الم نیم جان کئے ہوئے تھا۔ بہت سے بے فکر اس عالم میں بھی بے فکر تھے۔ اپنی

لوگوں میں ایک طرف کو ایک مردِ خدا خلوصِ دل سے عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر سکون اور اطمینان کے آثار تھے۔ یہی آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ بہت دیر کے بعد نظر اُٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا، لاڈوں کا پالا، جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی۔ جب نظر نے یاوری کی، تو دیکھا کہ ہاتھ کے اشارہ سے مولوی محمد باقر اپنے بیٹے آزاد سے کہہ رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہو گئی۔ اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسی حالت میں اپنے پیارے اور اکلوتے بیٹے کے لئے انھوں نے کیا کیا دعائیں مانگی ہوں گی۔

آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا۔ لیکن نہ ہو سکا۔ وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اُس وقت تک اُس وفادار سکھ جرنیل کی حفاظت میں رہے۔ جب تک شاہجہاں آباد کی یہ مقدس اور معصوم روحیں قفسِ عنصری میں قید رہیں۔

مولوی محمد باقر کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی شخصیت میں ایک خاص رنگا رنگی اور تنوع تھا۔ وہ بیک وقت مذہبی رہنما، بے باک اور نڈر اخبار نویس، علم دوست، سخن پرور اور وطن پرست مسلمان یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ذات بہت سی خوبیوں کا مرقع تھی۔ وہ

اپنے دَور کی ایک ایسی شمع تھے، جس کے بجھنے سے محفل پر تاریکی چھا گئی۔ انھوں نے شمالی ہندوستان میں صحافت کی اُس بنیاد کو مستحکم کیا جو آج کی اُردو صحافت کی بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ مولوی محمد باقر کا نام صرف اِس لئے زندہ نہیں ہے کہ وہ آزاد کے والد تھے بلکہ انھیں بقائے دوام بخشنے والی اُن کی اپنی خوبیاں اور اطوار تھے۔

آزاد کو بچپن سے وظیفے اور ورد پڑھنے کا شوق تھا۔ انسان کی فطرت کا قاعدہ ہے کہ جس ماحول میں وہ تربیت پاتا ہے۔ وہ اِس کی طبیعت پر اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ چونکہ اُن کا خاندان مجتہدین کا خاندان تھا۔ اس لئے وظائف اور اوراد کا شوق بھی قدرتی تھا چنانچہ اُنھوں نے سردار جریل سنگھ کے مکان میں رہ کر "دعائے صنم قریش" کا ورد شروع کیا۔ یہ وظیفہ چودہ دن تک آدھی رات کے بعد پڑھا جاتا ہے اور چودہ دن کے بعد دلی مراد بر آتی ہے۔ آزاد کو اِس وظیفہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ جریل سنگھ کے کیمپ کے پاس ایک کھنڈر مکان تھا۔ جو اِس وظیفہ کے لئے نہایت موزوں تھا۔ آزاد چودہ راتیں برابر وظیفہ پڑھ کر کھنڈر میں سوتے رہے۔ آخری رات کو آزاد نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص آیا ہے اور کہہ رہا ہے ——— "محمد حسین اُٹھ۔ لے کنجیاں لے ———" یہ آواز تین مرتبہ کان میں آئی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر کنجیاں تلاش کرنی شروع

کیں۔ آخر اِس نتیجہ پر پہنچے کہ قفلِ مراد کی کنجیاں ہاتھ آگئیں ——— آزاد اُٹھے اور چل دیئے۔

دلی شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی مار دی گئی۔ آزاد عجیب عالم میں دلی سے نکلے۔ مدہر مات اور پریشانیوں نے انھیں بڈھا کر دیا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ کہیں جانے کا رستہ نہ تھا۔ اُستاد کے کلام کا پلندہ بغل میں تھا۔ اس کے علاوہ سکھ سردار نے چلتے چلتے ایک دری اور آٹا گوندھنے کے لئے ایک لکڑی کا کٹرا (تسلا) بھی دے دیا تھا۔ وہ بھی ساتھ تھا۔ اور آزاد یہ اسباب اٹھائے، تھکے تھکے قدموں کے ساتھ شہر سے باہر چلے جا رہے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے اور اسباب کا بوجھ کندھوں پر تھا۔ ابھی جمنا کے پُل پر پہنچے ہی تھے کہ ایک فرنگی نے روک لیا۔ اور ساتھ ہی اپنی بندوق کی سنگین سے پلندہ اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اور کہا۔ اُوئے بڈھے، اس میں کیا ہے؟ سنگین اور پاؤں کی مدد سے پلندا کھولا۔ جب اُس میں سے پرانے کاغذات کے پرزوں کے علاوہ کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو بکتا ہوا چل دیا۔ آزاد نے بدقت تمام کاغذات جمع کئے اور جلدی جلدی انھیں باندھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دلی شہر بہت پیچھے رہ گیا اور محمد حسین آزاد نامعلوم راستے پر چل دیئے۔

آزاد کا بچپن

قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہیں۔ اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہے کہ وہ قدرت کی نیرنگی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔ اس امر کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۰ء میں آزاد کے والد مولانا محمد باقر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ قاتل نے اپنی طرف سے قتل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لیکن جس کو خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ مولانا محمد باقر شدید زخمی ہو گئے اور جان کے لالے پڑ گئے۔ اُسی سال جب دشمنوں نے اُن کا چراغِ حیات گُل کرنے کی کوشش کی تھی۔ قدرت نے اُن کے یہاں ایک ایسی شمع روشن کر دی۔ جس کی چمک دُور دُور تک پہنچی۔ جس کی روشنی آج بھی ادب کے اُفق پر اپنی رنگا رنگی کے ساتھ موجود ہے۔ وہی روشنی آبِ حیات بن کر ادب کے تنِ مُردہ میں نئی روح بن کر داخل ہوئی۔ آزاد کا وجود مولوی محمد باقر ہی کے لئے نہیں بلکہ اُردو ادب کے لئے بھی قابلِ فخر ثابت ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ بمطابق ۱۰ جون ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔

استاد ذوق نے آزاد کی تاریخ کا مادہ کہا "ظہورِ اقبال"۔ استاد ذوق کی کہی ہوئی تاریخ آزاد کی اقبال مندی کا دائمی نشان ہے۔

آزاد کی عمر تین چار برس کی تھی کہ اُن کی والدہ امانی بیگم کا انتقال ہو گیا۔ بقول مولوی ممتاز علی "اُن کے والد مولوی محمد باقر کو اپنی بیوی کے انتقال کا غیر معمولی صدمہ ہوا۔ چونکہ وہ کاروباری آدمی تھے۔ اس لئے اپنے بیٹے محمد حسین کی نوشت و خواند کا پورا انتظام نہ کر سکے۔ البتہ اُن کے دادا مولانا محمد اکبر جو اس زمانے میں پرانے دیسی طریقے پر مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اس وقت فارسی اور عربی کی تعلیم کا زیادہ رواج تھا۔ مولانا آزاد نے کچھ مذہبی اور درسی کتابیں اپنے دادا مولانا محمد اکبر سے پڑھیں۔"

والدہ کی وفات کے بعد آزاد کی گھریلو تربیت اُن کی پھوپی نے کی۔ جن کی وفات پر آزاد نے ایک خط میں لکھا کہ "ہمیں اِن دنوں صدمۂ عظیم ہوا۔ وہ یہ کہ میری پھوپی صاحبہ جنھوں نے مجھے پالا تھا اور ہمیشہ گھر کی مالک تھیں۔ اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور خوش اوقات تھیں۔ اُن کے سبب دل بڑا قوی رہتا تھا۔"

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آزاد کو جدید تعلیم دلوائی گئی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آزاد کے والد نہایت جدید خیالات کے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کے اسلوب اور طبیعت میں قدامت اور جدت متوازی ملتی ہے۔ جدید تعلیم کے لئے آزاد کو دہلی کالج میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دہلی کالج میں آزاد کا داخلہ ۱۸۴۵ء میں

ہوا۔ اور سولہ روپے ماہوار وظیفہ آزاد کو ملا۔

دہلی کالج اُس زمانے میں ہندوستان کا بہت بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ مسٹر ٹیلر اس کے پرنسپل تھے۔ اس مدرسے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں علومِ دینیہ کی تدریس کے ساتھ ساتھ علومِ متداولہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسٹر ٹیلر کی نگرانی میں انگریزی، ریاضی، جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ قاری جعفر علی اس کالج میں شیعہ دینیات کے معلّم تھے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ مولوی محمد باقر نے اپنے بیٹے محمد حسین آزاد کو پہلے اپنی نگرانی میں علومِ دینیہ کی منازل طے کرائیں۔ پھر مسٹر ٹیلر کے کہنے سننے سے آزاد کو دہلی کالج میں داخل کر دیا۔ تاکہ معقولات میں بھی دستگاہ پیدا کر لیں۔ محمد حسین آزاد شروع ہی سے بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ اب اُن کو مسٹر ٹیلر کی سرپرستی حاصل تھی۔ جو مولوی محمد باقر کے گہرے دوست بھی تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مولوی محمد باقر تعلیم اور تعلم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ بہت عجیب سی بات سمجھی جاتی تھی کہ ایک انگریز افسر کسی ہندوستانی کا گہرا دوست ہو۔ اور وہ بھی مولوی کا۔ اس عہد میں انگریز سے چھو جانا بھی نجس سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مولوی محمد باقر اور مسٹر ٹیلر میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اور شب و روز ملنا جلنا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ مولوی محمد باقر بڑے مرنجان مرنج، ہر دل عزیز اور غیر متعصب شخص تھے۔ وہ اگرچہ مجتہدوں کے خاندان سے تھے اور خود بھی

اجتہاد کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن اُن کے خیالات عام علماء کی طرح محدود اور تعصب انگیز نہ تھے۔ روشن خیالی اور بے تعصبی نے اُن کی شخصیت کو عام علماء سے بہت بلند بلکہ بلند تر کر دیا تھا۔

جب محمد حسین آزاد کالج میں داخل ہوئے تو اُن کو بھی قاری جعفر علی کی جماعت میں حاضر ہونا پڑا۔ مولوی محمد باقر، قاری جعفر علی کی کمزوریوں اور اُن کے مبلغِ علم سے کما حقہ واقف تھے کہ وہ اُنہی کے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خود بھی قاری صاحب سے دو ہدو نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے شاگرد ہمیشہ اُن کے اعتراضات کے جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے صاحبزادے یعنی قاری صاحب کے نئے شاگرد کو اس کے لئے پوری طرح تیار کر دیا تھا۔

محمد حسین آزاد، قاری صاحب کی تقاریر پر ہر روز نئے سے نئے اعتراض کرتے اور اپنے استاد کو عاجز کر دیتے۔ جب اِن فقروں نے بہت طول پکڑا تو قاری صاحب تنگ آ گئے اور سمجھ گئے کہ شاگرد کے پردے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ جب کچھ بن نہ آئی تو پرنسپل سے شکایت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد حسین آزاد کو فقہ شیعی کی جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ وہ سنّی جماعت میں فقہ سنت والجماعت پڑھیں۔ فقہ سنّی کے پروفیسر دہلی کے مشہور عالم دین مولوی سید محمد صاحب تھے۔ وہ بڑے روشن خیال اور پائے کے عالم تھے۔ اُنھوں نے

خوشی کے ساتھ محمد حسین آزاد کو اپنی جماعت میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

پہلے ہی دن مولوی سید محمد صاحب نے اپنے نئے شاگرد سے کہا کہ ہم نے سنا ہے تم مباحثہ خوب کرتے ہو۔ بھلا آج فلاں مبحث پر ہمارے سامنے تقریر تو کرو۔ ہم بھی دیکھیں کہ قاری جعفر علی تم سے اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ محمد حسین آزاد نے حکم کی تعمیل کی اور ایسی شستہ تقریر کی کہ مولوی سید محمد پھڑک اٹھے۔ اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے "ایسے ذہین اور ہوشیار انسان تو النادر کالمعدوم کا مصداق ہیں۔ صدیوں میں جا کر کہیں ایک دو آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ محمد حسین تم خاطر جمع رکھو۔ ہم تمھیں پڑھائیں گے اور خاص توجہ سے پڑھائیں گے۔"

محمد حسین آزاد نے علم فقہ اور دینیات کی تکمیل مولانا سید محمد صاحب کی سرپرستی میں مکمل کی۔ محمد حسین آزاد علم فقہ اور مسائلِ اسلامی سے پوری طرح واقف ہو گئے اس رہنمائی میں انھوں نے اپنے لئے ایک ایسا رستہ تلاش کر لیا جو تعصب اور تنگ دلی کے کانٹوں سے پاک تھا۔

دہلی کالج کی تعلیم و تربیت کے بارے میں آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر میں کالج میں نہ پڑھتا تو مولوی ہوتا۔ تنگ خیال متعصب اکھل اکھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، تقاضائے وقت سے اندھا اور بے بہرہ۔"

دراصل دہلی کالج اس اعتبار سے بھی ہمیشہ قابلِ ذکر کہا جائے گا کہ اس نے

جدید اور قدیم کی آمیزش سے تعلیم کا ایک ایسا کامیاب تجربہ کیا جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ دہلی کالج کے اساتذہ نے اپنے شاگردوں کے ذہنوں میں بدلتی ہوئی قدروں کا احساس بیدار کیا۔ اور زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

طالبِ علمی کے دور میں آزاد کو دو مرتبہ بہترین مضمون لکھنے پر انعام ملا۔ ۱۸۴۲ء میں مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا۔ آزاد کے مضمون کو اوّل انعام ملا۔ پروفیسر کوپ نے آزاد کے مضمون پر جو نوٹ لکھا وہ یہ تھا۔

"مشرقی شعبے کے طلبا میں محمد حسین کا مضمون سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں، جو نصاب سے باہر تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دہلی گزٹ یا دہلی اردو اخبار سے تھا اور اس لئے اسے اردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی اور ان سے اس نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔" ۵

اس بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آزاد کو بچپن ہی سے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اور ان کا مطالعہ محض نصاب کی کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ وہ ہر قسم کی کتابیں اور اخبار پڑھتے تھے۔

۱۸۴۱ء کے امتحان میں مضمون نویسی کے لئے پروفیسر مسٹر جے گنبز نے یہ عنوان تجویز کیا "اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیٔ رعایا کے بارے میں

کیا فرق تھا۔" اس سال بھی محمد حسین آزاد کا مضمون اُردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا۔

آزاد کو انشا پردازی اور خیال کی عظمت وراثت میں ملی تھی۔ محمد حسین آزاد اپنے ہمعصروں میں بہت ذہین اور طباع تھے۔ اور مضامین کے علاوہ وہ دہلی اُردو اخبار سے بھی منسلک تھے۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ ڈاکٹر مویٹ کمشنر مدارس و کلکتہ تشریف لائے اور انھوں نے دہلی کالج کا معائنہ کیا۔ اور ہر جماعت کا جزوی سا امتحان لے کر ہر طالب علم سے فرداً فرداً پوچھا کہ تم تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کرو گے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا لیکن محمد حسین آزاد کا جواب سب سے مختلف اور متنوع تھا۔ آزاد نے کہا کہ "میں تحصیل علوم کروں گا۔ اور جو خیالات میں اور ہوں گے۔ اُنھیں اپنے اہل وطن میں پھیلاؤں گا۔" خدا کی قدرت کہ آزاد پر ہزاروں انقلاب گزرے مگر وہ ارادہ بدستور قائم رہا۔

دہلی کالج کی تعلیم و تربیت سے محمد حسین آزاد کی اعتقادی دنیا پر پہلا انقلاب گزرا۔ خاندانی خصوصیت یعنی اجتہاد جو کہ بڑے سے بڑے رتبے کا ہم پایہ تھا کو آزاد نے اپنے دل سے نکال دیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر ملک اور قوم کی خدمت کروں گا۔

دہلی اردو اخبار پر آزاد کا نام بحیثیت پرنٹر اور پبلیشر ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۳ء سے آنا شروع ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزاد طالب علمی ہی کے دور میں اخبار سے

منسلک ہو گئے تھے۔ اور وہ ۱۸۵۷ء تک اس فرض کو ادا کرتے رہے۔

کالج میں آزاد کو مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور خواجہ ضیاء الدین جیسے ہم جماعتوں سے واسطہ پڑا اور یہی اُن کے دوست بھی تھے۔ جو بعد میں سب کے سب شمس العلماء ہوئے لیکن ہندوستان میں سب سے پہلا شمس العلماء کا خطاب پھر بھی آزاد ہی کو ملا۔ یہ تمام طالب علم اپنی ذہانت اور براقی طبع کے لئے کالج بھر میں مشہور تھے۔ آزاد کا ذہن ایسے ماحول اور اساتذہ کی خصوصی شفقت میں رہ کر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

دہلی کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آزاد کو اُستاد ذوق کا سایۂ عاطفت بھی میسر آ گیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے تمام ہم جماعتوں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

گو ایک طرح سے آزاد کے والد نے اپنے لڑکے محمد حسین آزاد کو بچپن ہی سے ذوق کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن خاص تعلیم کا آغاز کالج کے زمانے ہی سے ہوا۔ اُستاد ذوق نے محمد حسین کو آزاد کا تخلص دیا۔ آزاد تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اُستاد جہاں بھی جاتے آزاد کو اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ چنانچہ اس زمانے کے ہر مشاعرے اور جلسے میں یہ اُن کے ساتھ ہوتے۔ اُستاد ذوق آزاد کے حال پر کمال شفقت فرماتے اور اپنے علم و فضل کے خزانے بے دریغ اپنے عزیز شاگرد کو عطا کرتے۔ آزاد اسی طرح بیس اکیس برس اُن کے ظاہری اور باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے رہے۔ اصلاح سخن، شعر و شاعری، ہنر کے اور

معاملے، غرض تمام اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ اور جو حالات بچشمِ خود دیکھے تھے، وہ لوگوں کی زبانی سُنے۔ آزاد کو اپنے اُستاد کا بیشتر کلام زبانی یاد ہو گیا۔ غرض آزاد کی طبیعت نے فیضِ فانی روشنی حاصل کی۔

آزاد کی شعر گوئی کی ابتدا بھی اُستاد ذوق ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ اِس واقعہ کو آزاد نے دیوانِ ذوق میں یوں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"_____ کابلی دروازے کے پاس ہی مکان تھا۔ شام کو باہر مل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ رہتا۔ مضامینِ کتابی، خیالاتِ علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ، تصویر ہمیشہ، سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا۔ کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں اِسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ غوں غاں۔ کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔

ع:۔ سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ۔ ذرا تامل کر کے کہا۔ ہاں درست ہے۔

ع:۔ آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے لیجیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جب کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اُس مقام سے گزر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔"

آزاد کے دل میں اُستاد ذوق کا دیوان مرتب کرنے کا خیال اوائل عمری سے تھا۔ اُستاد کے انتقال کے بعد آزاد نے اُستاد کے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل کے ساتھ مل کر اُستاد کے کلام کی تدوین کا کام بھی شروع کیا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے سب کچھ برباد کر دیا۔ آزاد ذوق پرستی کا اندازہ یہاں سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب آزاد ۱۸۵۷ء میں گھر سے نکلے تو صرف اُستاد کا کلام ہی لے کر نکلے۔ بھرے گھر کو یونہی چھوڑ دیا۔ یہ وہ شیفتگی اور عقیدت ہے جو بڑے بڑوں کے حصے میں نہیں آتی۔

اُستاد کے انتقال کے بعد آزاد کو ذوقِ سخن اور اُن کے کمالات کی کشش نے حکیم آغا جان عیش کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اور آزاد ۱۸۵۷ء تک یعنی تقریباً تین سال تک حکیم آغا جان عیش سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اِن بزرگ نے غدر کے چند روز بعد اِس دنیا سے انتقال کیا۔ اس کے باوجود آزاد اپنے آپ کو صرف تلمیذِ ذوق ہی لکھنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی اُردو اخبار بابت ۴ مئی ۱۸۵۷ء میں آزاد کی ایک نظم "تاریخِ انقلاب عبرت افزا" کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

"_____ تصنیف مولوی محمد حسین المتخلص بہ آزاد تلمیذِ خاص حضرت خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد حضور والا دام ملکہ و اقبالہ۔"

۱۸۵۱ء کے لگ بھگ آزاد کی شادی تقریباً ۲۰ برس کی عمر میں ہوئی۔ اُنکی شادی مرزا محمد علی کی صاحبزادی آغائی بیگم سے ہوئی۔ مرزا محمد علی کے مورث

بھی ایرانی النسل تھے اور دہلی کے کوچۂ نشواں میں آباد تھے۔ مرزا صاحب نے اپنی جائیداد وقف کر رکھی تھی۔ اُن کا یہ محلّہ تقسیم ہند یعنی ۱۹۴۷ء تک امام باڑہ کہلاتا مگر اب امام باڑے کی جگہ گوردوارہ بن گیا ہے۔

دہلی میں آزاد نے اپنی عمر کا بہترین حصّہ بسر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب وہ غم ہائے روزگار کی کشاکش سے آزاد تھے۔ شعر و سخن اور اخبار نویسی اُن کا مشغلہ تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دہلی نے آزاد کو آزاد بنایا۔ دہلی نے آزاد کو جو کچھ بھی دیا، اس کی تفصیل بہت طویل ہے اور گہرے نفسیاتی پس منظر کی حامل ہے۔ دہلی نے اُن کے ذہن کی نشو و نما کی۔ انھیں عظیم اور شاندار روایات اور پس منظر عطا کیا۔ ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ اور پھر سب کچھ چھین لیا۔ اور وہ ہندوستان کی زمین پر بھٹکنے لگے۔ انگریزوں نے اُن پر بھی بغاوت کا الزام عائد کر دیا۔ آزاد کے زندہ یا مُردہ جسم کا انعام مقرر کر دیا گیا۔ جو پانچ ہزار روپے ۱۸۵۷ء میں تھا۔

۱۸۵۷ء کے صرف چند روز کے حالات اور مصائب نے آزاد کو قبل از وقت بڈھا کر دیا۔ چنانچہ ایک فرنگی نے آزاد کی تلاشی لیتے ہوئے انھیں "بڈھا" کہہ کر مخاطب کیا۔

آزاد دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ اُن کے کندھے بوجھ سے دُوہرے تھے، گرد میں اَٹا ہوا چہرہ، پھٹے ہوئے کپڑے، اور وہ جمنا کے دریا کا پُل عبور کر کے پورب کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ لڑکھڑاتے چلے جا رہے تھے، اور

اُن کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اُن کی منزل کہاں ہے اور کونسی ہے؟ مگر پورب کی طرف سے چلتی ہوئی خوشگوار ہوا کے جھونکے انھیں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ دہلی کی فضا میں رچی ہوئی بارود اور خون کی بُو لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

نیا دور اور نئی زندگی ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد

پورب سامن کے دیس نے آزاد کو اپنی گود میں پناہ دی ۔ دہلی سے نکلنے کے بعد سکھ جرنیل کی دی ہوئی وردی اور کنٹر آزاد کا کل سامان تھا اور بغل میں اپنے استاد کا کلام تھا ۔ آوارہ وطن ہو کر خدا جانے آزاد نے کہاں کہاں کی خاک چھانی ۔ آزاد صوبہ جات متحدہ اور اودھ میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن غدر کا ہنگامہ محض دہلی تک محدود نہ تھا ۔ بلکہ سارے ہندوستان پر محیط ہوا چاہتا تھا ۔ غرض کہیں بھی قرار نہ ملا ۔ کچھ مدت مارے مارے پھرے ۔ اس خانماں بربادی کی سیاحت کے دوران انھوں نے مختلف ذرایع سے روزی پیدا کی ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے ۔ کیا کیا دقتیں پیش آئی ہونگی ۔ اور کن کن مصیبتوں میں گرفتار ہوئے ہوں گے ـــــ ان تمام حالات کا تذکرہ کرنا تفصیل کے ساتھ ضروری ہے ۔

دہلی سے نکلنے کے بعد آزاد نے لکھنؤ کا رخ کیا ۔ جہاں اب بھی پرچم حریت

لہرا رہا تھا ۔ دلی کے باکمالوں کو اپنے دامن عافیت و قدر شناسی میں پناہ دینے کی مستحسن روایت ابھی تک لکھنؤ میں موجود تھی ۔ میر، سودا، سوز، مصحفی، انشا اور قتیل جیسے اساتذۂ فن نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ سلطنتِ لکھنؤ کی تباہی کے باوجود اب تک شاعروں اور ادیبوں کی قدر دانی عام تھی لیکن سیاسی طور پر لکھنؤ ابھی تک انگریزوں کے خلاف محاذ آرا تھا ۔ آزاد بھی اس دیس میں داخل ہو گئے ۔ اس سلسلے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ "آزاد کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی ۔ جگہ جگہ مسجدوں اور سراؤں میں ٹھہرتے ، محنت مزدوری کرتے ۔ آخر چلتے چلتے لکھنؤ جا پہنچے ۔ لکھنؤ میں اکثر لوگ واقف تھے اور مدت سے آزاد کو لکھنؤ دیکھنے کی تمنا تھی ، سو ان حالات میں پوری ہوئی" ۔ آزاد نے ۱۸۵۷ء کے آخری چند مہینے اور ۱۸۵۸ء کے چند مہینے لکھنؤ میں بسر کئے ۔ لیکن اپنا تعارف کسی سے بھی بحیثیت آزاد نہ کرایا ۔ کیونکہ ان کی گرفتاری کا پروانہ جاری ہو چکا تھا ۔ اور ہر جگہ ان کی تلاش باغی اور مفرور کی حیثیت سے جاری تھی ۔ آغا محمد باقر نے اس سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے ۔

"ـــــ اطلاع ملی کہ ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں اور گرفتار کروانے والے کے لئے پانچ ہزار کا انعام مقرر کیا گیا ہے ۔ یہ سن کر گھبرائے ۔ اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور لکھنؤ سے بھی روانہ ہو گئے ۔ آخر چلتے چلاتے مدراس جا پہنچے ۔ نیل گری کے ملٹری اسکول

میں ایک اُستاد کی ضرورت تھی۔ وہاں ملازمت کرلی۔ چند مہینے ملازمت کی اور وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہے۔ فارسی زبان کی تحقیقات کا بچپن سے شوق تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کے موبدوں سے ملے۔ اُن کے مذہبی جلسے دیکھے۔ اور ان کی زبان کا جائزہ لیا۔ آخر وہاں بھی زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ وہاں سے چلے تو پنجاب کا رُخ کیا۔ مالوے سے ہوتے ہوئے، شہر شہر کی سیر کرتے سنگرور ریاست جیند میں آکر دم لیا ــــــ"

"جیند پہنچ کر آزاد ۹ فروری ۱۸۵۹ء کو دفتر فوجداری میں محافظ دفتر مقرر ہوئے۔ آزاد نے آوارہ وطنی میں تقریباً دو سال گزارے۔ جیند پنجاب کی مشہور سکھ ریاست تھی۔ اس زمانے میں یہاں کا فرمانروا سروپ سنگھ تھا جو ۱۸۳۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ سردار سروپ سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا براہِ راست ساتھ دیا تھا۔ اس لئے اُس کی انگریزی سرکار میں خاص اہمیت تھی۔ اور آخر آزاد نے اس ملازمت سے بسبب خانگی استعفیٰ دے دیا۔ کہتے ہیں کہ راجہ صاحب نے آزاد کو از راہِ قدر دانی کچھ انعام بھی دیا۔ جیند کے قیام کے دوران انھوں نے متعدد قصیدے لکھے۔ اور مہاراجہ کی خدمت میں پیش کئے۔

ان قصائد کو پڑھنے کے بعد آزاد کی پریشان حالی کا اچھی طرح اندازہ کیا

جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب آزاد کسی بھی جگہ قیام پذیر نہ ہو سکے تھے۔ وہ اصل میں اس فکر میں تھے کہ کہیں سے معقول سہارا مل جائے تو مستقل قیام کرلیں۔ جیند کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر آزاد نے جگراؤں کا رُخ کیا۔ ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ ارسطو جاہ نے خود انھیں جگراؤں آنے کی دعوت دی تھی۔ مگر حالات و واقعات سے یہ بات ٹھیک طرح سے ثابت نہ ہو سکی۔

لدھیانہ میں ان دنوں ارسطو جاہ مولانا رجب علی شاہ صاحب میر منشی گورنر پنجاب نے مجمع البحرین کے نام سے ایک اخبار جاری کر رکھا تھا۔ اس واقعہ کو آزاد کے پوتے آغا محمد باقر نے یوں لکھا ہے:۔

"ــــــ یہ وہی رجب علی شاہ ہیں۔ جو مولانا محمد اکبر اور مولانا محمد باقر کے شاگرد تھے۔ لدھیانہ پہنچ کر آزاد ناظم مطبع سے ملے۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں ایک کاتب کی ضرورت تھی۔ آزاد ایک تو پریس کے کام سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوسرے انھوں نے بچپن میں کتابت بھی سیکھی تھی، کہ پرانے زمانے کے لوگ اپنے بچوں کو خوشنویسی ضرور سکھاتے تھے۔ چنانچہ آزاد نے اپنے خط کا نمونہ پیش کیا۔ جو منتظم صاحب نے پسند کر لیا۔ اور اُن کو ملازم رکھ لیا۔ کتابت کے کام کے ساتھ ساتھ مولوی رجب علی کے بچوں کی تعلیم بھی آزاد کے سپرد ہوئی

رجب علی اکثر دورے پر رہا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی لدھیانے آیا کرتے تھے۔ آزاد اس پریس میں کتابت کی خدمات نہایت دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ وہ اپنے فرائض منصبی سے جب فرصت پاتے تو اپنے استاد کے کلام کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے اور اس کو ترتیب کے ساتھ لکھتے۔ بچے بھی یہ باتیں دلچسپی کے ساتھ دیکھتے۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ رجب علی شاہ لدھیانہ آئے تو بچوں نے اُن سے اپنے نئے اُستاد کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اور جب فرصت پاتے ہیں شعر اشعار لکھتے ہیں۔ رجب علی شاہ صاحب کو بھی ملنے کا اشتیاق ہوا کہ دہلی کا ایسا کون شخص آن پھنسا ہے۔ کہتے ہیں۔ جب آزاد کی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو عجیب منظر تھا۔ پے در پے صدمات اور انقلابات سے آزاد بڈھے ہو گئے تھے اور پہچانے نہ جاتے تھے۔ انھوں نے آزاد کو پہچانا گلے سے لگایا۔ حالات پوچھے اور ہر طرح کی خاطر جمعی کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا اور مجبور کیا کہ اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلا لیں۔

آخر آزاد نے رجب علی شاہ کی عنایات سے مجبور ہو کر اپنے خاندان کو جو اس وقت سونی پت میں منشی بشیر حسین کی مہمانی میں تھا، بلوا لیا۔ جو کام اُس وقت آزاد نے اختیار کیا تھا۔ وہ اگرچہ اُن کے

گزارنے کے لئے بہت کافی تھا۔ انھیں چودہ پندرہ روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اُن کی بلند ہمت اور ترقی کرنے کا جذبہ انھیں آگے پہنچانا چاہتا تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ کاروبار محض جینے کا سہارا ہے۔ اور قدرت نے آزاد کو کسی اور کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس وقت غدر کو ڈھائی تین سال ہو چکے تھے۔ دہلی سے نکلے ہوئے لوگ جہاں جہاں بھی موجود تھے۔ وہ اپنی معافیوں کی تصدیق کرا کر آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن آزاد کو ابھی تک اطمینان نہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے معافی حاصل نہ کی تھی اور ڈر تھا کہ کوئی چغلی نہ کر دے۔ لیکن پھر بھی اُن کو ارسطو جاہ کی پناہ کا بہت بڑا سہارا حاصل تھا ——"

اور آخر عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اور آزاد کو اپنی جان اور اہل و عیال کی جان و مال کے تحفظ کا پرمانہ حاصل ہو گیا۔

دسمبر ۱۸۶۰ء میں ڈائریکٹر تعلیم جگراؤں آئے اور ڈاک بنگلے پر قیام پذیر ہوئے۔ آزاد کو اُن کی آمد کے بارے میں علم ہوا تو وہ بھی اُن سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ آزاد شعبہ تعلیم سے اپنی بنیادی دلچسپی کا اظہار کریں اور اپنے خیالات سے ڈائریکٹر کو آگاہ کریں۔ آزاد کی یہ ملاقات بہت سود مند ثابت ہوئی۔ ڈائریکٹر تعلیم نے آزاد کے خیالات کو پسند کیا۔ لیکن ڈائریکٹر صاحب بہت جلد یہ گفتگو بھول گئے۔

اسی دوران آزاد کو معلوم ہوا کہ اُن کے ایک عزیز لاہور کے پوسٹ ماسٹر آفس میں پوسٹ ماسٹر ہو گئے ہیں۔ یہ عزیز آزاد کے چچوپی زاد بھائی مرزا محمد علی تھے۔ آزاد نے اِس وقت کو غنیمت جانا اور لاہور پہنچنے کی سبیل نکالی۔

آزاد ایک مدت سے ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ آزاد نے لاہور کے بارے میں یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ یہ شہر تعلیم اور تعلیمات میں ایک بڑا گہوارہ بن جائے گا۔ اُن دنوں لاہور میں تعلیم کا کوئی خاص چرچا بھی نہ تھا۔ آزاد لاہور آ گئے ان کے چچوپی زاد بھائی مرزا محمد علی نے کمال مہربانی سے آزاد کو اپنے گھر میں رکھا اور پھر پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں سررشتہ دار (ڈائریکٹر) کی نوکری دلوائی۔ آزاد اِس دفتر میں تین ماہ تک بلا تنخواہ کام کرتے رہے اور آخر اُن کا تقرر سرکاری طور پر ۱ جولائی ۱۸۶۱ء کو ۳۰ روپے ماہوار پر ہوا۔

آزاد ابھی بھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ لدھیانہ میں وہ ڈائریکٹر تعلیم سے ملاقات کر چکے تھے، اور محکمۂ تعلیم کو اپنی زندگی کا مستقبل بنانے کے آرزو مند تھے۔ معاش کا سہارا اُنھیں مل چکا تھا۔ اور اب اُنھوں نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی باقاعدہ اور بھرپور کوشش شروع کر دی۔ ۵ مئی ۱۸۶۱ء کو آزاد نے ایک خط ڈائریکٹر تعلیمات کو لکھا۔

"——— بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں پہنچا۔ اور محکمۂ محتشمہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر میں سررشتہ دار ہے۔

چونکہ حضوری خدمتِ حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد متصور ہیں جن سے کہ خلقِ خدا کو فوائد حاصل ہوتا اور خدا اور نائبانِ خدا رضامند ہوں اور واسطے ہمیشہ کے نیک نام یادگار ہے۔ اُمیدوار ہوں کہ بنظرِ علم پروری اور جوہر شناسی اپنے وقتِ فرصت سے فدوی کو مطلع فرمایئے۔ کہ حاضرِ حضور ہو کر دولتِ لازوال حاصل کروں ——— " (مکتوبات آزاد ص ۲۲۳)

اِس زمانے میں آزاد سیر و سیاحت کی غرض سے سیالکوٹ سے ہوتے ہوئے کشمیر نکل گئے۔ آغا محمد باقر اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"——— مولانا کے چچوپی زاد بھائی سیالکوٹ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ کچھ عرصے کے لئے آزاد سیالکوٹ آئے اور وہاں سے ایک دم کشمیر جنتِ نظیر کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ کشمیر کی سیر کر کے واپس آئے تو سیالکوٹ ہی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں پرانی اور نایاب کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ جہاں سے کوئی اچھی کتاب ملتی خرید لیتے۔ پھر بڑے بڑے افسروں کو خطوط کے ذریعے اطلاع دیتے کہ میرے پاس فلاں کتاب برائے فروخت ہے۔ ابھی یہ سلسلہ اچھی طرح چلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُن کے بہنوئی لاہور تبدیل ہو گئے۔ یہاں ارسطو جاہ رجب علی شاہ گورنر کے میر

منشی تھے ——"

آزاد دسمبر ۱۸۶۲ء تک ڈاک کے محکمے میں ملازم رہے۔ جب آزاد کو "اوورسیر" بنا کر ملتان بھیجا جانے لگا تو آزاد نے استعفےٰ دے دیا۔ اور گورنر پنجاب کے منشی ہو گئے۔ یہاں وہ فرمان اور چٹھیاں فارسی میں لکھتے تھے، جن کی نقلیں آج بھی راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔

دفتری ملازمت کے باوجود آزاد کا ادبی ذوق اپنی پوری آب و تاب اور جوش کے ساتھ انگڑائیاں لیتا رہا۔ بظاہر وہ مختلف محکموں میں کام کرتے رہے لیکن ان کا دل اور دماغ ادب ہی میں الجھا ہوا تھا۔ اور انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ کتاب "آئینۂ صحت" حکومت کو پیش کی۔ گورنمنٹ نے آزاد کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لیکن حکومت نے آزاد کو لکھا کہ وہ اس کتاب کے لئے گورنمنٹ سے انعام کے لئے سفارش کرے گی۔ مگر بات دب گئی۔

ہر انسان کے گرد حاسد ضرور ہوتے ہیں۔ آزاد کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو مرزا محمد علی برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے خفیہ طور پر گورنمنٹ کو اطلاع دی کہ یہ محمد حسین آزاد وہی شخص ہے، جس کے باپ کو غدر کے بعد مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا اور اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے۔

غدر کو اگرچہ تین چار سال گزر چکے تھے اور عام معافی کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی حکومت ایسے لوگوں سے احتراز کرتی تھی۔ جنھوں نے غدر میں انگریزوں

کے خلاف کوئی عملی حصہ لیا تھا چنانچہ تحقیقات شروع ہوئیں اور اس امر کی اطلاع آزاد کو بھی مل گئی۔ جب یہ بات آزاد کے اندرونِ خانہ پہنچی تو سب پریشان ہو گئے، اور رونا دھونا شروع ہو گیا۔ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ بہت جلد یہ تحقیقات ختم ہو گئیں اور آزاد پر کسی قسم کا الزام عائد نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کا اُلٹا اثر ہوا کہ آزاد ڈاک کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد محکمۂ تعلیم میں آ گئے۔ جہاں اُن کو تیس روپے کی بجائے پچھتر روپے ماہوار ملنے لگے۔

لیکن آزاد کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہونے کا ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے۔ جس کو اکثر لوگوں نے لکھا ہے۔ جو اپنی نوعیت کا خاصہ دلچسپ واقعہ ہے مصنف "داستان تاریخ اُردو" لکھتے ہیں کہ:۔

"—— آخر ایک مدت کے بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور پنڈت من پھول میر منشی لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپے کے ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں میجر فلڈ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمائش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجئے۔ ایک بار موقع مل گیا میجر فلڈ نے کوئی تحریر اُردو میں لکھی۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ ایجاد مذکر ہے میجر صاحب نے کہا کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین سررشتہ دار کو دکھائی ہے۔

مولوی صاحب بلائے گئے۔ اُنھوں نے اعتراض سُن کر کہا کہ آپ کے محکمے میں جو مولوی محمد حسین آزاد ملوی ہیں۔ اُن کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر صاحب نے آزاد کو بلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھ دیا۔ ع

ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے
نسخے میں معجونِ زر بنیاد ہے

میجر صاحب خوش ہو گئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔"

(داستان تاریخ اُردو۔ صفحہ ۴۱۴)

بحر حال واقعہ کچھ بھی ہو۔ آزاد محکمہ تعلیم میں آ گئے۔ اور یہاں سے اُنھوں نے اپنی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ جو آگے چل کر شہرۂ آفاق صورت اختیار کر گئی۔ محکمۂ تعلیم کی ملازمت آزاد کا شروع ہی سے آئیڈیل تھی۔ یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ آزاد کو ذہنی سکون اور اطمینان اپنے ہم عصروں کی نسبت بہت دیر بعد میسر آیا۔ ۱۸۵۷ء کے اثرات کے زائل ہونے میں ایک وقت ضائع ہو گیا۔ مگر وہ گہرائی کے ساتھ اُن کے لاشعور میں داخل ہو گئے۔ جن کے اثرات بہت دیر میں ظاہر ہوئے۔ آزاد محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے دہلی کالج کے بہترین اور ذہین ساتھی زندگی کی دوڑ میں آزاد سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر ہو چکے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ مدراس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے۔ لیکن آزاد ابھی تک ٹھوکریں ہی

کھا رہے تھے۔ لیکن اب محکمۂ تعلیم میں آنے کے بعد آزاد نے بھی عروج کے زینے پر قدم رکھا اور کامرانی کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ڈائریکٹر تعلیمات اِن دنوں محکمۂ تعلیم کی طرف سے ایک تعلیمی اخبار جاری کرنا چاہتے تھے۔ اِس کے لئے اُنھیں ایک اُردو اخبار نویس کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ یہ تجویز تھی کہ انجمن پنجاب کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی جائے۔ جو پنجاب میں تعلیم و تعلم کو فروغ دے۔ اور یہ اخبار اِس انجمن کے مفید مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ اِس تحریک اور تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آزاد کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں۔ وہ ایک ایسے شخص تھے۔ جن کو اخبار نویسی کا تجربہ پہلے سے تھا۔ جو اخبار محکمۂ تعلیم نے جاری کیا، اُس کا نام "اخبار آتالیقِ پنجاب" تجویز ہوا۔ سب سے پہلے اُس کے ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال آشوب مقرر ہوئے، اور سب ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ آزاد کو پچیس روپے ماہوار ملنے لگے۔

اسی ایڈیٹری کے دوران آزاد نے تحقیق و تصنیف کا کام بھی جاری رکھا۔ آزاد نے ۱۸ جون ۱۸۶۴ء کو "قواعد عربی" نامی کتاب کا مسودہ گورنمنٹ میں پیش کیا۔

پھر اسی سال یعنی ۲ جولائی ۱۸۶۴ء ہی کو گورنمنٹ سے "منطق" پر ایک کتاب لکھنے کی اجازت مانگی۔ راقم الحروف کے پاس اس رسالے کا قلمی مسودہ موجود ہے۔ محکمہ نے اِس کتاب کی اجازت دے دی۔

ہم اِن مرحلوں کو آزاد کی اُدبی زندگی کے نئے دَور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آزاد آہستہ آہستہ اپنے فن اور فن کے جوہر کی آبداری کو ان چھوٹے چھوٹے رسالوں کی تخلیق سے آزما رہے تھے۔ اُن کا اصل مقصد ابھی بھی بہت دُور تھا۔

۱۸۶۴ء میں آزاد نے تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے ایک اور کتاب لکھی، جس کا نام "نصیحت کا کرن پھول" تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف آزاد نے پنڈت من پھول کے نام کی رعایت سے لکھی تھی۔ کیونکہ وہ اُن کے اچھے دوست اور مُربّی تھے۔ "نصیحت کا کرن پھول" آزاد کی وہ پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جس سے اُردو اَدب باقاعدہ متعارف ہے۔ لیکن اِس کی اشاعت بہت دیر کے بعد ہوئی۔

اِسی سال آزاد کا تعارف ڈاکٹر لائیٹنر سے ہوا۔ آزاد ڈاکٹر لائیٹنر سے بہت متاثر ہوئے۔ اُس کی وجہ وہ مشترکہ احساس تھا جو دونوں میں نمایاں تھا۔ ڈاکٹر لائیٹنر کی طبیعت میں لسانی تحقیق کا جو ذوق موجود تھا وہ آزاد میں بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ لائیٹنر ہی کے ذریعے آزاد انگریزی اَدب سے روشناس ہوئے۔

۱۸۶۴ء میں ہی گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ بہت دنوں سے یہ تجویز حکومت کے زیرِ غور تھی کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نمونے پر ایک کالج لاہور میں بھی بنایا جائے۔ ڈاکٹر لائیٹنر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائیٹنر کا نام پنجاب کی لسانی اور اَدبی زندگی میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ

ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ماہر تھے۔ جن کی تعداد دو سَو کے قریب بنتی ہے۔

آزاد اُن دنوں انگریزوں کو اُردو بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر لائیٹنر آزاد کی ذہانت اور علمی و تنقیدی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور آزاد نے بھی اُن کے اثرات کو قبول کیا۔ محکمۂ تعلیم اور لائیٹنر کی رفاقت اور ہمّت افزائی نے آزاد کے حوصلے مزید بلند کر دیئے۔ اور انہی شخصیوں کی رفاقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ڈاکٹر لائیٹنر نے "انجمن پنجاب" کے قیام کی تجویز پیش کر دی۔

چنانچہ ۱۲ جنوری ۱۸۶۵ء کو "سکھشا سبھا" کے مکان میں لاہور کے سَرِبرآوردہ لوگوں کا اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت من پھول نے صدارت کی اور انھوں نے انجمن کے قیام کے مقاصد اور فوائد پر ایک تقریر میں روشنی ڈالی اور ڈاکٹر لائیٹنر کا تعارف کرایا۔ اور "انجمن پنجاب" کی بنیاد رکھی۔ اس جلسے میں محمد حسین آزاد بھی شریک تھے جو اُس وقت محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیم تھے۔

اور اچانک آزاد ۱۸۶۵ء میں سفرِ ترکستان پر روانہ ہو گئے۔ بہت کم لوگوں کو اُن کی روانگی کی اطلاع تھی۔ آزاد نے انجمن کے جلسوں کو خیرباد کہا اور حکومت کی ہدایت پر رختِ سفر باندھا اور سمرقند، ترکستان اور بخارا کی سیاحت کو نکل گئے۔

سینٹرل ایشیا کا سیاسی سفر ؟

کہا جاتا ہے کہ یہ سفر آزاد نے اس لئے قبول کیا کہ حکومت کو اُن کی مخلصانہ وفاداری کا یقین ہو جائے۔ اور یہی ایسا موقع تھا۔ جب آزاد ۱۸۵۷ء کے الزام کو دھو سکتے تھے۔ یہ مشن بہت خطرناک تھا۔ اب تک جتنی مہمیں اس سلسلے میں روانہ کی گئیں تھیں۔ اُن میں سے کوئی بھی زندہ بچ کر نہ آیا تھا۔ یہ بات آزاد کو بھی معلوم تھی۔ کیونکہ وہ اس خفیہ سیاسی مشن کے ایک اہم رکن تھے۔ اور ایسے رُکن تھے جس نے سب سے زیادہ دُور تک کا دورہ کیا۔ اور بخیر و عافیت واپس آئے۔

اس مشن کا سیاسی پس منظر یہ تھا کہ اُن دنوں روس کا بڑھتا ہوا رسوخ ہندوستانی سیاست کے لئے ایک مستقل کابوس تھا۔ اندیشہ تھا کہ روس وسط ایشیا کے ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لا کر ہندوستان پر حملہ آور ہو گا۔ چنانچہ اس کے سدِ باب کے لئے حکومت برطانیہ نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کئے۔ روس نے بھی خیوا کے حکمران پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام

بنا کر فروخت کرتا ہے اور اُس پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس حملے میں روس کو ناکامی ہوئی۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں قدم بڑھائے۔ اس سلسلے میں سفارتی سطح پر بھی بات چیت ہوئی جو ناکام ہو گئی۔ روس نے بخارا اور ججند پر قبضہ کر لیا۔

برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں مکمل رپورٹ حاصل کی جائے۔ اس مشن کو انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ اور اس کے لئے چار اشخاص کو منتخب کیا گیا۔ یعنی

۱۔ پنڈت من پھول

۲۔ محمد حسین آزاد

۳۔ منشی فیض بخش پشاوری

۴۔ کرم چند نند رام

آزاد کے لئے یہ منصوبہ دو وجہ سے اہم تھا۔ ایک یہ کہ انھیں ترکستان اور اسلامی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسرے یہ کہ یہ سیاسی خدمت انجام دے کر وہ گورنمنٹ کے مقربین میں داخل ہو جائیں گے اور غدر کے عواقب سے نجات مل جائے گی اور وہ سکون کے ساتھ تصنیف و تالیف کر سکیں گے۔

معتبر ذرائع سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس سفر میں مولانا آزاد نے ایک آزاد مُنش طالب علم کی حیثیت سے سفر کیا۔ ایک دو جگہ نا بنائی کا کام بھی کیا اور کچھ عرصے تک غرغیتان میں طلبہ کو تعلیم دیتے رہے۔ یہ کسی کو ٹھیک طرح سے معلوم نہیں کہ آزاد نے پنڈت من پھول کی نگرانی میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔

تمام کے تمام ممبرانِ مشن نے جعلی اور فرضی ناموں سے سفر کیا اور اپنے پیشے بھی تبدیل کر لئے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ پنڈت من پھول نے بھائی دیوان سنگھ جہاجن کا نام اختیار کیا۔

۲۔ محمد حسین آزاد نے بہاؤ الدین کا نام اختیار کیا۔

۳۔ فیض بخش نے غلام ربانی کا نام اختیار کیا۔

۴۔ کرم چند نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا۔

آزاد نے اپنے خاندان کو لاہور سے دہلی روانہ کر دیا اور حکومت پنجاب نے آزاد کو ایک تار کے ذریعے مری طلب کیا اور ایک سوال نامہ جاری کیا، جس کے مطابق آزاد نے سنٹرل ایشیا کے حالات کی گورنمنٹ کو رپورٹ کرنا تھی۔ یہ لوگ الگ الگ قافلوں کے ذریعے ۱۳ دسمبر ۱۸۶۵ء کو کابل پہنچے۔ آغا محمد اشرف نے آزاد کی ایک بیاضِ سفر کے حوالے سے اس سفر کے حالات یوں لکھے ہیں۔

"یہ ہر قدم پر طالب علم کی سی سادہ زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی منزل پر روٹی اور کباب خرید کر اپنا پیٹ بھرا۔ یا ایک وقت کے کھانے پر اکتفا کیا۔ موقع ملا تو آٹا، گھی اور دال خرید کر خود کھانا تیار کیا۔"

کابل پہنچتے ہی آزاد نے سوا تین روپے کی ایک پوستین خریدی۔ وسطی علاقوں کی سردی بھی مشہور ہے۔ پانی کی کمی، موسم کی شدت، رہزنوں اور ڈاکوؤں کا خوف، آزاد نے سفر جاری رکھا اور دسمبر کے وسط میں بخارا پہنچ گئے۔ بخارا وہی ہے جو علم و

فضل، مسجدوں، حماموں اور قہوہ خانوں کے افسانوں کا شہر ہے۔ اسلامی دنیا میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ آزاد نے بخارا سے سمرقند کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں یہاں روسی حملے کا ہر وقت خطرہ لاحق تھا۔ سمرقند میں انتہائی ابتری اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن آزاد نے ابھی اور آگے جانا تھا۔

چمکنت سے آزاد دریائے آرس کے کنارے پہنچے۔ یہ وہی علاقہ تھا کہ جہاں انیسویں صدی میں روس کے قبضے کے بعد کسی غیر ملکی باشندے کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ گو دریائے آرس اس سیاسی مشن کی آخری منزل تھی اور اس منزل تک صرف ایک شخص زندہ پہنچا اور واپس ہندوستان آ گیا۔ اس کا نام تھا محمد حسین آزاد۔

پنڈت من پھول کابل سے آگے نہیں گئے تھے۔ صرف آزاد اور فیض بخش نے ترکستان کے اندرونی علاقے کا رُخ کیا تھا۔ جب بہت عرصے تک آزاد کی کوئی اطلاع پنڈت من پھول کو نہ ملی تو انھوں نے آزاد کی تلاش میں کرم چند کو روانہ کیا۔ کرم چند خوقند تک گیا اور آخر آزاد کا پتہ چل گیا۔

مولانا کے کاغذات سے جو نوٹس راقم الحروف کو ملے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے بہت سی یادداشتیں روسی زبان میں لکھی تھیں۔

آزاد کے سفر کا راستہ بالکل وہی تھا جس پر آجکل شاہراہ ریشم بنی ہوئی ہے۔ بدخشاں کے قیام کے بعد آزاد نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کافرستان

چترال اور دیر کا رُخ کیا۔ آزاد کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ یہ راستہ بہت خطرناک اور قدرتی حسن کا لازوال خزینہ تھا۔ راستے کے مصائب سے لڑتے آزاد اپنے قافلے کے ہمراہ کافرستان میں داخل ہوئے۔ یہاں غیر لوگ آبادی میں داخل ہونے سے بچتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ کافروں کو ستیاحوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ چترال پہنچ کر قافلے نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں ایک نئی مصیبت اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ مہاراجہ کشمیر کے ایجنٹ نصر اللہ خاں جو اُن سے بدخشاں میں ملا تھا نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ سب انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ بہت مشکل سے اس قافلے کی جان چھٹی۔

آزاد کے اس سفر کے بارے میں آغا محمد باقر[10] نے چند دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ سفر کی مشکلات کے بارے میں واضح نشاندہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"_____ افغانستان کی سرحد پر آزاد کو افغانوں نے پکڑ لیا اور کہا تم جاسوس ہو۔ اور ہمارے ملک میں جاسوسی کرنے آئے ہو، ہم تمھیں قتل کر دیں گے۔ آزاد نے بہت یقین دلایا کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ انھوں نے ایک نہ سُنی۔ آخر اُن افغانوں نے یہ تو مان لیا کہ تم جاسوس نہیں ہو مگر تم کافر ہو اور ہمارے ملک میں کافر کی سزا موت ہے۔ مولانا نے بہت یقین دلایا کہ میں کافر نہیں ہوں اور

اور قرآن کی آیات پڑھ کر سُنائیں۔ وہ اس بات پر اڑ گئے کہ تم ہمیں دھوکہ دے رہے ہو۔ آخر مولانا نے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ میں کس طرح سے اپنا مسلمان ہونا ثابت کر سکتا ہوں۔ آخر ایک شخص نے کہا کہ تم مختون ہوئے تو ہم تمھیں چھوڑ دیں گے ورنہ قتل کر دیں گے۔ اس فیصلہ کو سب نے تسلیم کر لیا اور آخر مولانا یہ ثابت کر کے بہت مشکل سے نکلے۔"

آزاد دریائے آمو (دسیحون جیحون) تک گئے، اور وہاں سے ایک عجیب انداز سے واپس پلٹے۔ یہ واقعہ آغا محمد اشرف نے لکھا ہے:۔

"_____ ترکستان کے سفر میں آزاد کی ملاقات ہمزاد سے ہوئی۔ روسی سرحد کے اندر مولانا آزاد نے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک درویش کی حیثیت سے سفر کیا۔ سردی کے موسم میں سب سے گرم جگہ سرائے میں تندور کے پاس ملی۔ یہ وہیں لیٹ گئے۔ چراغ کی روشنی میں انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص بالکل اُن جیسا تھا سامنے کھڑا ہے۔ اس مشابہت کو دیکھتے ہوئے انھیں شک ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انھیں اُس وقت ہوئی جب کہ یہ شخص اُن کے قریب آیا اور آکر بیٹھ گیا۔ اور بولا کہ میرا نام محمد حسین ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جنگل بیابان میں گھر سے سوں دُور ایکا ایکی مولانا نے جب اُس سے اپنا نام سُنا تو گھبرا کر سرائے سے فوراً روانہ ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ

میرا راز فاش ہو گیا ہے اور اب جان کی خیر نہیں ——"

اگرچہ وسط ایشیا کے سفر کی نوعیت محض سیاسی تھی لیکن آزاد نے اس سفر سے بہت کچھ حاصل کیا۔ سمندرِ فارس اور دریا بِ اکبری کا بعض مواد اسی سیاحت کا مرہونِ منت ہے۔

آخر آزاد چترال سے دیر آئے اور دیر سے ہوتے ہوئے، نومبر ۱۸۶۶ء کو پشاور پہنچے اور اپنی رپورٹ گورنمنٹ کو پیش کر دی۔ —۹

آزاد اور انجمنِ پنجاب

آزاد اچانک دلی پہنچے تو گھر والے انھیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ میری والدہ بیان کرتی ہیں کہ جب مولانا دلی پہنچے تو عجیب حالت تھی پہچانے نہ جاتے تھے۔ لباس اور وضع قطع سے بالکل درویش اور قلندر معلوم ہوتے تھے۔ جب انھوں نے اپنی کابلی پوشش کو اتار کر ایک دیوار پر ڈالا تو ان کپڑوں میں کابل اور بدخشاں کی اتنی بڑی بڑی جوئیں تھیں کہ وہ تھوڑی سی تمازتِ آفتاب سے باہر نکل پڑیں اور ساری دیوار بلا مبالغہ سیاہ ہو گئی۔

اس غیر حاضری میں آزاد کی محکمۂ تعلیم کی ملازمت ختم ہو گئی اور آزاد از سرِ نو فکرِ معاش میں پریشان ہو گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس موقع پر آزاد کی مدد کی اور ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ء کے انجمنِ پنجاب کے جلسے میں یہ تجویز پیش کی کہ "اگر محمد حسین آزاد کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا جائے تو یقین ہے کہ انجمن کو بہت ترقی اور رونق ہو گی۔ انجمن کے رسالے کی ترتیب اور یونیورسٹی کا کچھ کام وہ کریں، اس طرح رسالے کے

چھپوانے میں بھی ماہواری التوا بھی نا ہو گا۔"

سب ممبران نے اس تجویز کو قبول کیا اور آزاد کو ۳۰ روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت میں یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر بھی مقرر ہوئے۔ ہر ہفتے دو لیکچر آزاد طلبہ کو دیتے تھے۔ انجمن کی ملازمت نے آزاد میں نئی روح پھونک دی اور وہ اس ملازمت پر ۲۲ جون ۱۸۶۸ء تک فائز رہے۔ آزاد شب و روز انجمن کے کام میں منہمک رہے۔ ہر علم دوست اور پڑھے لکھے فرد سے ملتے۔ کسی کو انجمن میں شرکت کے لئے آمادہ کرتے اور کسی کو مضمون لکھنے کے لئے آمادہ کرتے۔ اور کسی سے انجمن کے کتب جانے کے لئے کتابیں مستعار حاصل کرتے۔ اس طرح مولانا کی محنت سے انجمن ترقی کرتی چلی گئی۔ یہ ترقی سب کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث تھی۔ لوگ دور دور سے اس کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے آتے۔ مضامین بھیجتے اور درخواست کرتے کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

انجمن کی معتمدی اور اپنے سیاسی سفر کی کامیابی کے باعث آزاد اعلیٰ حکام میں بھی خاص اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ اور وہ اکثر گورنر کی سرکاری اور ذاتی تقریبات میں عزت و احترام کے ساتھ مدعو کئے جاتے تھے۔ راقم الحروف کے پاس وہ تمام دعوت نامے محفوظ ہیں جو آزاد کو سرکاری سطح پر جاری کئے گئے تھے۔

آزاد کی زندگی کا یہ دور ادب کے لئے ایک تابندہ دور کی حیثیت

رکھتا ہے۔ انھوں نے بے شمار مضامین، مقالے اور لیکچر لکھے۔ بے شمار مضامین جن کی اندازاً تعداد دو سو سے زائد ہے، انجمن کے جلسوں میں پڑھے۔ جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس ادبی مصروفیت کے ساتھ ساتھ آزاد نے انجمن کے رسالے کو بھی سنبھالا۔ آزاد نے اس رسالے میں ادبی رنگ پیدا کیا اور مضامین کے معیار کو بڑھایا جس سے رسالہ انجمن پنجاب عظیم ادبی سرمایہ کا روپ دھار گیا۔

انجمن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے باوجود آزاد اس ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ تعلیم کے محکمہ ہی کو اپنا اصلی میدان سمجھتے تھے چنانچہ جب محکمہ تعلیم نے آزاد کو سہارا دیا تو آزاد انجمن کے فرائض سے الگ ہو گئے اور مری چلے گئے۔ اور چند ماہ وہاں رہے۔

۱۸۶۶ء اور ۱۸۶۸ء میں آزاد نے وہ مضامین انجمن کے رسالے میں لکھے۔ جو آگے چل کر آب حیات کی بنیاد ثابت ہوئے۔ شاید اسی زمانے سے آزاد کے ذہن میں ایک ایسا تذکرۂ شعرا لکھنے کا خیال تھا۔ جو بعد میں "آب حیات" بن کر منظر عام پر آیا۔

مری میں آزاد، راولپنڈی کے انسپکٹر تعلیمات مسٹر پیرسن کے ساتھ تاریخ ہند لکھتے رہے۔ جس کے بارے میں گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ "مسٹر پیرسن ایک مسلمان فاضل سے بھی تاریخ ہند کے سلسلے میں مدد لے رہے ہیں۔

جو اپنی طرز تحریر اور انشا پردازی میں شہرت رکھتا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد اپنی انشا پردازی کے حوالے سے اُس زمانے میں بھی بہت مقبول تھے۔

اگست ۱۸۶۹ء میں آزاد "سرکاری اخبار" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اب بھی انگریزوں کو اُردو پڑھایا کرتے تھے ۱۸۶۹ء میں "ہنری کیلی" مشہور انگریز مورخ اُن کا شاگرد تھا۔ اسی زمانے میں آزاد نے شہرہ آفاق "آرڈر ریڈرز" لکھیں جو تقریباً نوے سال تک پرائمری جماعتوں کے نصاب میں شامل رہیں۔ اس سے بڑا اعزاز ایک ادیب کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔

آزاد ان ریڈروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان سے کوئی فائدہ مقصود نہیں تھا۔ یہ ملک اور قوم کی ضرورت کی چیزیں تھیں" آزاد کی ان کتابوں نے ملک گیر شہرت اختیار کی۔ مگر افسوس اُن کی یہ محنت اُن کے نام سے شائع نہ ہوئی۔ ان کتابوں پر پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کا نام دیا گیا۔ مگر بعد میں آزاد کا نام بھی شائع ہونے لگا۔

آزاد نے ان ریڈروں کی تصنیف کے مرحلے کو ایک خط میں نہایت سچائی اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مجھے ایک بار پھر ان ریڈروں کے لئے بوڑھا ہو کر بھی بچہ بننا پڑا ہے۔!

انہی دنوں گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ چار موضوعات پر انعامی مقابلہ

ہوگا اور اوّل آنے والی کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے گا۔ موضوعات یہ تھے۔

۱۔ عام اصولِ صرف و نحو۔

۲۔ فارسی صرف و نحو۔

۳۔ تاریخ ہند سے ماخوذ کہانیاں۔

۴۔ اہم شخصیات اور اُن کے واقعات۔

اس اعلان کے جواب میں آزاد نے "قصص ہند" اور فارسی قواعد صرف و نحو" لکھی۔ جس پر آزاد کو ۱۔ نومبر ۱۸۶۹ء میں پہلا انعام دو سو روپے کا دیا گیا۔ اور نصاب میں شامل کر لیا گیا

ان دنوں ہندوستانی عوام تعلیم نسواں کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ مولانا نے تعلیم نسواں کے لئے ہمیشہ سے کوششیں جاری رکھی تھیں۔ انہی دنوں گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ "دختر کشی" پر مقالے لکھے جائیں۔ آزاد نے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ اور ایک ڈرامہ لکھا۔ جو نثر میں اُردو ادب کا پہلا باقاعدہ ڈرامہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس کو اسٹیج بھی کیا گیا۔ ۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو اعلان نمبر ۵۶۱ کے تحت آزاد کو اس ڈرامے پر دو سو روپے کا پہلا انعام ملا۔ حکومت کو آزاد کی تجاویز بھی دختر کشی کے سلسلے میں پسند آئیں اور انھیں ایک حکم کے ذریعے نافذ کرنے کی سفارش بھی کی گئی۔

آزاد کی ادبی کاوشوں اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آزاد کو عربی کے پروفیسر کی نوکری مل گئی اور آخر آزاد اُس منزل پر پہنچ گئے جس کے لیے وہ ۱۸۵۸ء سے کوشش کر رہے تھے۔

آزاد اور گورنمنٹ کالج لاہور

۲ اگست ۱۸۶۹ء کو آزاد کو گورنمنٹ کالج لاہور میں تقرری کا پروانہ موصول ہوا۔ وہ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے لیکن یہ تقرر عارضی تھا چونکہ مولوی علمدار حسین جو گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے بیمار ہو گئے اور انھوں نے تین ماہ کی رخصت لی۔ آزاد کو جو تقرری کی اطلاع ملی وہ آج بھی راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے جس میں لکھا تھا کہ "اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ مولوی علمدار حسین کی غیر موجودگی میں جو تین مہینے کی علالتی رخصت پر ہیں، لاہور گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے ہیں اور آپ کو ۵۰ روپے ماہوار مشاہرہ ملے گا، درخواست کی جاتی ہے کہ آپ جلد از جلد اپنی ملازمت کا جائزہ لیں۔ دستخط کرنل ہالرائیڈ"

آزاد نے خدا کا شکر ادا کیا اور ملازمت پر چلے آئے۔ مولوی علمدار حسین نے ۱۴ مئی ۱۸۷۰ء کو وفات پائی اور آزاد اُن کی جگہ مستقل ہو گئے۔ اور مستقل ہونے

کے بعد آزاد کو اس عہدے کی پوری تنخواہ ایک سو پچاس روپے ماہوار ملنے لگی۔

گورنمنٹ کالج سے آزاد کی سنہری زندگی اور تابناک ادبی مستقبل کا آغاز ہوا۔ آزاد کی بے اطمینانی ختم ہو گئی وقار بڑھ گیا اور آزاد پوری توجہ اور محنت کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

گورنمنٹ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد آزاد کی صحافتی سرگرمیوں میں زیادہ اضافہ نہ ہوا۔ بلکہ ان کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انجمن پنجاب نے رسالے "ہمائے پنجاب" کا آزاد کو ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں آزاد کو انجمن سے پچاس روپے ماہوار بطور الاؤنس ملنے لگے۔ اس کی سفارش خود لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے آزاد کے لئے کی تھی۔

اسی زمانے میں ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ آزاد ایک بے باک، سچے اور کھرے صحافی باپ کے بیٹے تھے۔ ان میں بھی یہ تمام اوصاف موجود تھے۔ ہوا یوں کہ ۱۸۸۱ء میں سیالکوٹ کے نامہ نگار ہمائے پنجاب کا خط آزاد نے شائع کر دیا۔ اس نامہ نگار نے لکھا تھا کہ ڈاک خانے کے ملازم لفافے میں کوئی قیمتی چیز اور نوٹ وغیرہ دیکھ کر اسے ایسی خوبی سے تراشتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا۔ اس خط کی اشاعت پر بہت ہنگامہ ہوا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل نے صدر انجمن پنجاب سے شکایت کی اور آزاد کے خلاف کارروائی شروع ہو گئی۔ اور آزاد کو ایڈیٹری سے فوری طور پر ہٹا دیا گیا۔ اس زمانے میں کالج کی چھٹیاں ہو گئیں۔ آزاد نے پرنسپل ڈاکٹر لائیٹنر کو درخواست دی

کہ انہیں باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ ڈاکٹر لائیٹنر نے جواب لکھا کہ آزاد کی ایڈیٹری میں یہ خط شائع ہوا تھا، اور ڈاک محکمے پر الزام عائد کیا گیا تھا، اس لئے پرنسپل کے پیش نظر مولانا صاحب کی دیانت داری کو مشتبہ سمجھنے کے اسباب ہیں۔ لہٰذا اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آزاد پر یہ بات بہت گراں گزری۔ پھر انہی دنوں انجمن کے جملہ کاغذات بھی آزاد سے واپس لے لئے گئے۔ اس کا آزاد کو بہت صدمہ ہوا۔

آخر آزاد نے تنگ آ کر ڈاکٹر لائیٹنر کو خط لکھا:

"آج تیسرا دن ہے۔ میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اگر روکیں تو کسی لیفٹیننٹ گورنر کو روکیں۔ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لئے فخر نہیں۔ امید ہے اجازت مرحمت ہو گی۔"

(مکتوبات آزاد ص ۱۱)

ڈاکٹر لائیٹنر سے آزاد کی دوستی یہیں پر متاثر ہوئی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو نگاہوں میں رکھنے لگے۔ یہ گرہ الجھتی گئی اور تعلقات کشیدہ تر ہوتے چلے گئے آخر ستمبر ۱۸۸۱ء میں ڈاک کا یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ مگر ڈاکٹر لائیٹنر سے تعلقات بحال نہ ہو سکے۔

انہی دنوں آزاد اور ڈاکٹر لائیٹنر نے مل کر ایک کتاب "سنین الاسلام" لکھنی شروع کی۔ مگر یہ کتاب ڈاکٹر لائیٹنر نے آزاد سے چھین لی اور اپنے نام سے شائع کر دی۔ کہا

جاتا ہے کہ اس کتاب کا مواد ڈاکٹر لائیٹنر نے فراہم کیا تھا۔ اور اُسے لکھا آزاد نے تھا۔ یہ آزاد کی ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ جو آزاد کی ہوتے ہوئے بھی آزاد کی نہ ہو سکی۔ یہ تکرار بڑھتی گئی۔ آزاد اپنا حق ثابت کرتے رہے اور ڈاکٹر لائیٹنر بگڑتے چلے گئے اور یہ تکرار جو کاروباری تھی، ذاتی رنجش کی شکل اختیار کر گئی۔ اور ڈاکٹر لائیٹنر نے آزاد پر سختی شروع کر دی اور حکم جاری کر دیا کہ آزاد کالج کے اوقات کے بعد طلبہ کو عربی کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ آزاد نے جواباً درخواست دی کہ اس طرح طالب علموں کا ہرج ہوگا مگر اُسے رد کر دیا گیا۔ یہ شاید اس لئے کیا گیا تھا کہ آزاد کے طالب علموں کا نتیجہ خراب نکلے اور آزاد سے باز پرس کی جا سکے۔ اور ہوا بھی یہی کہ پندرہ میں سے چار طالب علم کامیاب ہوئے۔ مگر آزاد پر اس لئے حرف نہ آیا کہ وہ پہلے ہی ایک درخواست میں یہ بات واضح کر چکے تھے۔

مگر آزاد پھر بھی اپنے ادبی کاموں میں بے فکری سے مصروف رہے۔ ۱۱ جنوری ۱۸۷۰ء کو انجمن پنجاب کا اجلاس فنگری ہال لارنس گارڈن (موجودہ باغ جناح ہال) میں منعقد ہوا۔ آزاد بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ اور اسی سال آزاد نے ایک سو بیس روپے چندہ انجمن کو بھی دیا۔

۱۸۶۹ء کے بعد ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء بھی یونہی گزر گئے۔ آزاد خاموشی کے ساتھ اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ انجمن کے اجلاسوں میں وہ شریک

ہوئے مگر ان اجلاسوں کی رونق بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ آزاد اب انجمن کے ایک عام ممبر تھے۔

اسی سال یعنی ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء میں آزاد نے اپنے وہ لیکچر جو طالب علموں کو دیئے تھے "سخندان فارس" کے نام سے عوام میں پیش کر دیئے۔

پھر ۱۸۷۴ء ایک ادبی انقلاب کا سال بن کر آزاد اور برصغیر کی تاریخ میں اُبھرا آزاد نے جدید نظم کی بنیاد ڈالنے کا نظریہ پیش کیا اور اُسے تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور برصغیر کے کونے کونے سے اس نظریے کی باقاعدہ تائید کی آوازیں اُبھریں۔ اور آزاد کا جدید نیچرل شاعری کا نظریہ خاص و عام میں مقبولیت حاصل کرتا گیا۔

ع

جدید نظم کی بنیاد اور آزاد

مدتِ قریب پانچ سو سال سے زائد ہو چکے تھے کہ اُردو شاعری پر عشق و عاشقی کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ ولی سے لے کر ذوق و غالب تک ہزاروں شاعر ہوئے لیکن بدستور وہی محبت کے ترانے گائے، کوئی بھی اپنے ڈگر سے نہ ہٹا۔ مضمون لے دے کر وہی ایک تھا اور ہزاروں بولیاں تھیں۔ آخر اس میں کہاں تک رنگینیاں پیدا ہوتیں۔ اب جدت پسند طبیعتیں اور نئی روشنی کے لوگ نئی چیزیں طلب کر رہے تھے۔ لیکن ہماری شاعری کا دامن اُن پھولوں سے خالی تھا۔ جدت آتی تو کہاں سے آتی۔" آغا محمد باقر کا یہ بیان عین اُن حالات کی عکاسی کرتا ہے، جو اُردو شاعری کا بظاہر سکہ بن چکے تھے۔

اکثر بڑے بڑے کام معمولی باتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نظم اُردو کے جدید شاعروں کے سلسلے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔

پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے جب مدرسوں کے نصاب کا جائزہ لیا،

اُنھوں نے محسوس کیا کہ بنیادی جماعتوں کے طالب علم جب شاعری پڑھتے ہیں تو وہ اُن کی عمر اور تجربے سے بہت آگے ہوتی ہے۔ جو اُن علموں کے لیے قطعی مناسب نہیں ہے۔ اُنھوں نے خیال ظاہر کیا کہ طالب علموں کو اُس نظم سے آشنا کیا جائے جو فطرت اور قدرت کے قریب تر ہے۔ گورنر نے یہ بات پنجاب کے ناظمِ تعلیمات کرنل ہالرائڈ سے کہی۔ اور ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی کہ اس سلسلے میں سب سے بہترین مشورہ دینے والا شخص محمد حسین آزاد ہوگا۔ آزاد محکمۂ تعلیم کے ایک ذمہ دار فرد سمجھے جاتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں اُن کے نئے نئے نظریات کی پہلے ہی بہت دھوم تھی۔ ان شاعروں کا اصل مقصد بچوں کے نصاب کے لیے اعلیٰ نظمیں مہیا کرنا تھا۔ آزاد کے سپرد سرکاری طور پر یہ کام سپرد کر دیا گیا تھا۔ اور یہ اُردو ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ اور اُردو شاعری نے عشق و عاشقی کے سمندر میں ایک اور براعظم دریافت کر لیا۔

۱۶ مئی ۱۸۷۴ء کو اُردو میں پہلا انقلاب آیا۔ انجمن پنجاب کے مکان سکشا بھا میں ایک جلسہ جدید اُردو نظم کے سلسلے میں منعقد ہوا۔ جدید نظم کے حوالے سے سب اہلِ فکر کے کان تو پہلے ہی کھڑے ہو چکے تھے۔ مجمع بہت زیادہ تھا۔ آزاد نے سب سے پہلے جدید اور قدرتی نظم کے حوالے سے ایک مقالہ اُس کے تعارف کے طور پر بعنوان "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" پڑھا۔ اور آخر میں نمونے کے طور پر ایک مثنوی "رات کی آمد" پڑھی۔ آزاد نے اپنا مقالہ انتہائی انقلابی انداز

میں پیش کیا اور کہا کہ :-

"میں نے آجکل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں جنھیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گزارش کرتا ہوں۔ اہلِ نظر یہ بھی دیکھیں گے آزادگی آزاد نے اس میں کئی قسم کی قیدوں کو توڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ مثنوی ہے۔ مگر جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں۔ ان سے قدم بڑھائے ہوئے ہے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ ان بحروں میں گنجائش کم ہے۔ ساتھ اس کے یہ کہ جو بحریں مثنوی کی خاص ہیں۔ انھیں کسی مذہب نے خاص نہیں کیا۔ اب کہیں علی العموم ہر قسم کے مضامین کا نظم کرنا ہے۔ پس کچھ گناہ نہ ہوگا کہ اگر ہم قصیدے یا غزل کی بحر میں مثنوی کہہ دیں ——"

آزاد کی مثنوی کے بعد کرنل ہالرائڈ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جلسہ اس لئے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو جو تنزلی اور بدحالی کا شکار ہے اس کی ترقی کا سامان کیا جائے۔ میں اہلِ نظر سے درخواست کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے اس پر توجہ کریں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو اشعار سنائے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ ہم سب کو مولانا آزاد کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ ایک نمونہ ہے جس کا رواج دینا مقصود ہے۔

کرنل ہالرائڈ نے ایک مقامی جلسے کی تمام کارروائی آزاد کے لیکچر اور نظم سمیت چھپوا کر ہندوستان کے تمام صوبوں کے تعلیمی سربراہوں کو روانہ کی۔

مقامی طور پر آزاد کی اس تحریک کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ نئی روایت اور نئے تجربے سے نفسیاتی طور پر خوف کھاتے تھے۔ سب سے زیادہ مخالفت لاہور اور لکھنؤ والوں نے کی۔ لاہور میں مخالفت کھڑی کرنے والا "پنجابی اخبار" تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود بڑے پیمانے پر آزاد کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ لاہور کے پنجابی اخبار نے ہی بعد میں آزاد کی حمایت میں مضامین لکھے اور اس طرزِ نظم کو سراہا۔ علی گڈھ سے "علی گڈھ اخبار" نے آزاد کے اس اقدام کو احترام کی نگاہ سے دیکھا اور سرسید احمد خاں کے ایما پر ایک مضمون بھی اس کی حمایت میں شائع ہوا۔ یہ مخالفت اور حمایت ابھی جاری تھی کہ باقاعدہ مشاعروں کا آغاز کر دیا گیا۔ سب سے پہلا باقاعدہ مشاعرہ ۳۰ مئی ۱۸۸۴ء کو منعقد ہوا۔

۳۰ مئی ۱۸۸۴ء کو ہونے والے پہلے جدید اردو مشاعرہ میں جو عنوان دیا گیا وہ تھا "برسات"۔ اس اجلاس میں مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی نظم "برکھا رت" پیش کی۔ اس مشاعرے کے بعد آئندہ مشاعرے کے لئے "سرما" یا "زمستان" عنوان تجویز کیا گیا۔

۳۰ جون ۱۸۸۴ء کو دوسرا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں نو شاعروں نے شرکت کی۔ گارسن دتاسی لکھتا ہے کہ اس مشاعرے کو دیکھ کر دلی کے اردو

معلّٰی کے بازار کا دھوکہ ہوتا تھا۔ مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر متحیر ہوتے تھے۔ شراب و ساقی کا تذکرہ نایاب ہو گیا اور قدرت ہی قدرت ہر شعر میں نمایاں نظر آنے لگی۔ اخباروں نے تنقید کرتے ہوئے اس مشاعرے کے بارے میں لکھا کہ آزاد نے اپنے نام کی مناسبت سے شاعری کو ہر طرح سے آزادی دے دی ہے۔ پنجابی اخبار نے آزاد کی مخالفت کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا کہ آزاد مضمون ہذا کو پڑھ کر اپنی بگڑی ہوئی زبان اور پوچ خیالات کی درستگی کی کوشش کریں۔ یہ تبصرہ جو ۲۵ جولائی کو شائع ہوا، ذاتی قسم کے اعتراضات کا مجموعہ تھا۔

۳ اگست ۱۸۷۳ء کو تیسرا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کا موضوع "امید" تھا۔ اس مشاعرے میں سترہ شاعروں نے شرکت کی جن میں حالی بھی شامل تھے۔ گارسن دتاسی نے لکھا کہ بہت سے شاعروں کی روش نئی ہے اور قابلِ تعریف ہیں۔ پنجابی اخبار کے نمائندے نے مرزا اشرف بیگ کی مثنوی کی تعریف کی۔ اور اُسے سادگی حسن کا مجموعہ قرار دیا۔ آزاد نے اس مشاعرے میں نظم "صبحِ امید" پڑھی۔ پنجابی اخبار نے حسب دستور اس کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ تبصرہ ۱۰ اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا۔ مگر آزاد اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ اسی نظم پر کوہ نور اخبار نے تعریفی کلمات کہے اور آزاد کے نظریات کو بلند پایہ قرار دیا۔ اس مخالفت کی اصل وجہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کا بڑھتا ہوا ادبی اقتدار

قرار دیا ہے۔

یکم ستمبر ۱۸۷۳ء کو چوتھا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کا موضوع "حبِ وطن" تھا۔ اس میں ۱۳ شاعروں نے شرکت کی جن میں حالی بھی شامل تھے۔ اس مشاعرے میں جو شاعر نہ آسکے اُن کا کلام آیا، جو پڑھ کر سنایا گیا۔ پنجابی اخبار نے آزاد کے بارے میں لکھا کہ اُن کے پڑھنے کا انداز جاذب توجہ تھا مگر نفسِ مضمون کمزور تھا۔ اسی اخبار نے حالی کے بارے میں لکھا کہ رات بیت چکی تھی مگر حالی کی مثنوی اپنے پورے جوبن پر تھی۔

اکتوبر ۱۸۷۳ء کو پانچواں مشاعرہ ہوا جس کا موضوع تھا "امن"۔ اس مشاعرے میں گیارہ شاعروں نے شرکت کی۔ آزاد نے اس مشاعرہ میں "خوابِ امن" نامی مثنوی پڑھ کر سنائی۔ اس مشاعرے میں حکومت کے اعلیٰ افسران اور اخبارات کے بہت سے نمائندے شریک ہوئے اور اس طرزِ شاعری کو سراہا۔

۳ نومبر ۱۸۷۳ء کو چھٹا مشاعرہ ہوا جس کا موضوع "انصاف" تھا۔ اس میں کل ۱۳ شاعر شریک ہوئے جن میں حالی بھی تھے۔ آزاد نے "دادِ انصاف" کے عنوان سے اپنی مثنوی پیش کی۔ پنجابی اخبار نے پھر مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ آزاد کی نظم کا معیار سطحی تھا لیکن کوہ نور اخبار نے لکھا کہ آزاد کی نظم اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ سب سے نمایاں تھی۔

۱۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ساتواں مشاعرہ منعقد ہوا۔ موضوع تھا "مروّت"

اِس جلسے میں آزاد نے "وداعِ انصاف" مثنوی پڑھی۔ اِس مشاعرے میں کل ۱۴ شاعروں نے شرکت کی۔ آزاد کو پنجابی اخبار نے پھر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور باقی تمام شعرا کے کلام کو سراہا۔ جبکہ دہلی اخبار نے لکھا کہ آزاد کا رنگ سب سے زیادہ شگفتہ اور نازک ہے۔ اِس مشاعرے میں بڑے بڑے رؤسا شریک تھے جو صرف اِس مشاعرے کی شہرت سُن کر آئے تھے۔

مشاعروں کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ پنجابی اخبار کی مخالفت رنگ لائی اور آزاد دل برداشتہ ہو گئے۔ آزاد نے سرسید کو لکھا کہ میں اِس لئے اِن مشاعروں سے الگ ہو رہا ہوں کہ کہیں میری ذاتی مخالفت اُردو شاعری کی ترقی اور اصلاح میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ سرسید احمد خاں نے آزاد کا حوصلہ بڑھایا اور آزاد کو لکھا

"_____ حالاتِ مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا۔ شعر و سخن پر رد و قدح دوسری چیز ہے۔ اِلّا آپس کا نفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنا اِس مجلسِ مشاعرہ سے بر آئی تھی۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خوابِ امن" پہنچی۔ دل بہت خوش ہوا۔ حقیقتِ شاعری اور زورِ سخنوری کی داد دی ہے۔ آپ اپنے کلام کو اور نیچر کی طرف مائل کریں۔ لوگوں کے طعنوں سے مت

ڈریں۔ میں بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اِس باب میں لکھوں گا۔ بسبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا _____"

(از سرسید احمد خان۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء)

سرسید نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ۷ فروری ۱۸۷۵ء کو "تہذیب الاخلاق" میں ایک طویل مضمون "علم انشا اور اُردو نظم" پر لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ "مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اِس مشاعرے کے بقا اور قیام کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ہمت صرف کی ہے۔ اُن کی طبیعت کا زور اور پاکیزگی، مضامین اور شوکتِ الفاظ اور طرزِ ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ان کی مثنوی" خوابِ امن" ہمارے دلوں کو خوابِ غفلت سے جگاتی ہے۔"

---

۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو آٹھواں مشاعرہ ہوا۔ عنوان تھا "قناعت"۔ اِس مشاعرہ میں ۱۷ شاعروں نے شرکت کی۔ اِس مشاعرے میں طلبہ نے بھی شرکت کی۔ لاہور سے باہر کے بہت سے پروفیسر اور رؤسا اور لوگ شریک ہوئے۔ گارسن دتاسی لکھتا ہے کہ سب سے پہلے شمع طالب علم شاعروں کے آگے آئی۔ پھر پرانے شاعروں کے سامنے گئی۔ اُن میں آزاد کے تخیل اور کلام نے سب کا دل موہ لیا۔

۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو نواں مشاعرہ ہوا۔ عنوان تھا "تہذیب"۔ آزاد نے اِس مشاعرے میں "مصدرِ تہذیب" کے عنوان سے مثنوی پڑھی۔ پنجابی اخبار نے حسب

معمول آزاد کی مخالفت کی۔ اور یہ مشاعرہ اُردو نظم کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔

آزاد نے اِس تمام مخالفت کے باوجود عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور کسی تنقید کا جواب نہیں دیا۔ آزاد نے صرف ایک خط میں لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ میری مخالفت کون کر رہا ہے۔ انجمن قصور میں انوار الحق ادیب ایک شخص دہلی کا رہنے والا ہے۔ وہی میری مخالفت میں پنجابی اخبار میں لکھتا ہے۔ یہ شخص بدچلنی کے الزام میں راولپنڈی نارمل اسکول سے نکالا گیا تھا — ظاہر ہے کہ آزاد ایسے شخص کی بات کا جواب دینا اپنی توہین خیال کرتے ہوں گے۔

مارچ کے مشاعرے کے بعد انجمن سے آزاد الگ ہو گئے اور اُن کے بعد کوئی اور مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا۔ کیونکہ مشاعروں کے رُوح رواں وہی تھے۔ آزاد گئے تو مشاعرے بھی ختم ہو گئے۔

آبِ حیات اور اورینٹیل کالج

۱۸۷۵ء تا ۱۸۸۵ء

۱۸۷۵ء آزاد کی زندگی کا مصروف ترین سال شمار کیا جا سکتا ہے۔ تمام انجمنوں اور کمیٹیوں سے آزاد نے علیحدگی اختیار کر لی اور صرف درس و تدریس اور اور تصنیف و تالیف میں دن رات مگن ہو گئے۔ آزاد نے باقاعدہ ادب کی جانب توجہ کی اور ان خیالات کو ترتیب دینا شروع کیا، جو اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں عرصے سے بے قرار تھے۔ سب سے پہلے "نیرنگِ خیال" پھر "آبِ حیات" اسی دور کی دو شہرۂ آفاق تصنیفات ہیں۔ جو آزاد کو بقائے دوام کے بازار میں لے آئیں۔ آزاد کی زندگی کے یہ دس برس بھی مجموعی طور پر پریشانی اور فکر میں بسر ہوئے، انقلاباتِ زمانہ اور گردشِ ایام نے بہت گرد اُڑائی مگر آزاد برسرِ پیکار رہے" دریائے اکبری" جیسی عظیم تاریخی کتاب کی بنیاد بھی انہی دس برسوں میں پڑی۔ آزاد کے بے شمار مقالے انجمن مفیدہ عام قصور میں شائع ہوئے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے ۱۸۷۵-۷۶ء آزاد کی نجی زندگی پر بہت گراں گزرے۔ انھیں داغِ جگر اور داغ دگر سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۸۷۵ء میں آزاد کے ایک بیٹے مُلّا محمد باقر نے چھوٹی سی عمر میں وفات پائی۔ پھر دوسرے ہی سال ۱۸۷۶ء میں آزاد کے دوسرے بیٹے خلیفہ محمد اکبر نے بھی داغِ مفارقت دیا۔ آزاد اپنے ایک دوست کو اپنے بیٹے مُلّا محمد باقر کی وفات کے واقعہ کو یوں لکھتے ہیں:-

"ـــــ مُلّا محمد باقر عید کے دوسرے دن صبح کو سات بجے مر گئے۔ خیر خداوندِ عالم آئندہ خیر رکھے ـــــ"

(مکتوباتِ آزاد ص۶۶)

پھر خلیفہ محمد اکبر کی وفات کے بارے میں اپنے شاگرد لالہ دُنی چند کو لکھتے ہیں کہ:-

"ـــــ صاحب کیا کہوں پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لو تو جب میرے اس خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو خلیفہ محمد اکبر جب پورے تین مہینے کے ہوئے تو انھیں بھی مُلّا صاحب کے پہلو میں جا کر سُلا آیا ـــــ"

(مکتوباتِ آزاد ص۷۹)

۱۸۷۶ء میں آزاد کافی مصروف رہے۔ انھیں آبِ حیات کے سلسلے میں اور ذاتی غرض سے کئی سفر کرنے پڑے۔ جنوری میں وہ اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم ابرو کے ساتھ الور، دلّی اور جے پور گئے۔ دلّی میں آغا محمد ابراہیم کو چیچک نکل آئی۔ آزاد بہت پریشان ہوئے۔ وہ اپنے بیٹے کو پیار سے ابرو کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں:-

"ـــــ اس عرصے میں سرگرداں پھرتا رہا، دلّی گیا۔ الور گیا، جے پور گیا۔ ابرو کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُسے چیچک نکل آئی۔ مجھے اس فکر میں عجب عالم گزرتا رہا۔ انجام بخیر ہوا اور اس سمیت چودہ کو داخلِ لاہور ہوا ـــــ"

(مکتوباتِ آزاد ص۵۲)

اگست کے مہینے میں آزاد ڈاکٹر لائیٹنر کے ساتھ سرکاری کام کے سلسلے میں شملہ گئے۔ شملہ جاتے ہی آزاد کو پھنسیاں نکل آئیں۔ آزاد کے ڈاکٹر لائیٹنر سے تعلقات پہلے ہی کشیدہ تھے۔ مگر ساتھ ایک محکمہ کی وجہ سے تھا۔ ایک خط میں آزاد نے اس سفر کا ذکر یوں کیا ہے:-

"ـــــ ڈاکٹر صاحب شملے آئے اور مجھے ساتھ لیتے آئے یہاں آتے ہی میرے پھنسیاں نکل آئیں اور چار دن سے اُن کے پاس بھی نہیں گیا ـــــ"

(مکتوباتِ آزاد ص۵۲)

۱۸۷۶ء میں آزاد نے ایک درخواست دی کہ گورنمنٹ کالج کے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اُن کا کام بھی بڑھ گیا ہے۔ کام کے

اضافے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اُنھیں حسنِ خدمت کے صلے میں کم از کم ایک ہزار ایکڑ زمین ضلع لاہور میں عطا کی جائے۔ اُنھوں نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا کہ اُن کا ارادہ ایک ماڈل فارم بنانے کا ہے، جہاں وہ جدید طریقے کے مطابق کاشت کاری کریں گے اور نئے نئے تجربات کریں گے، جو ملک اور قوم کے لئے فائدہ مند ثابت ہونے کا امکان ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے اِس درخواست کے جواب میں ایک نوٹ لکھا، جو راقم الحروف کے پاس آج بھی موجود ہے ـــــ اُنھوں نے لکھا کہ طلبہ کی تعداد بڑھنے سے کام کسی بھی طرح نہیں بڑھا۔ پہلے مولوی صاحب چار پانچ گھنٹے پڑھاتے تھے، اَب صرف آدھ گھنٹہ دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کی صلاحیتوں کے احترام کے باوجود اُن کا مقابلہ مولوی ذکاء اللہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ جو کلکتہ ہائیکورٹ کا وکیل اور مولوی آزاد کا ہم جماعت ہے۔ مولوی محمد حسین کے سلسلے میں پرنسپل کے تجربے کو مدِ نظر رکھ کر کوئی اَدبی کام اُن کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی صاحب آج سے سات سال پہلے ناظمِ تعلیم کے دفتر میں ایک معمولی عہدے پر تھے۔ یہ پرنسپل کی عنایات ہیں کہ وہ آج اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ وسطی ایشیا کے سیاسی مشن میں بھی مولوی آزاد کی کارکردگی اُن کے رفیقِ کار فیض بخش جیسی نہیں تھی۔ وہ اِس کالج میں اچھا کام کر رہے ہیں لیکن اُن کی فطرت

سازشی ہے۔

پرنسپل اُن کے ماڈل فارم کے ارادے پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ اگر وہ گورنمنٹ کالج سے الگ ہو جائیں تو پرنسپل کو خوشی ہو گی ـــــ"

لائٹنر کا یہ نوٹ مولانا کی تذلیل کے برابر تھا۔ اَب سچ مچ دونوں میں ٹھن گئی۔ اور باقاعدہ مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ اِس نوٹ کے پس منظر میں سنین اسلام والا قصہ بھی شامل ہے۔ دراصل ڈاکٹر لائٹنر کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح آزاد گورنمنٹ کالج سے الگ ہو جائیں۔ لیکن اُس کی کینہ پروری طبیعت کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ کہ آزاد کالج سے الگ ہو کر گورنمنٹ کی عنایت کا فائدہ اُٹھائیں۔ ۱۸۷۶ء آزاد پر بہت سخت گزرا اور پھر ۱۸۷۷ء میں اُنھیں ایک گھریلو صدمہ پہنچا۔ اُن کی پھوپھی کا انتقال ہو گیا، جنھوں نے آزاد کو ماں بن کر پالا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ـــــ ہمیں اِن دنوں صدمۂ عظیم ہوا۔ وہ یہ کہ میری پھوپھی صاحبہ، جنھوں نے مجھے پالا تھا۔ اور جو ہمیشہ سے گھر کی مالک تھیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہ نہایت نیک نہاد اور خوش اوقات تھیں۔ اُن کے سبب سے دل بڑا قوی رہتا تھا۔ اچھا جو اللہ کی مرضی، وہی مالک ہے، گھر میں اندھیرا نظر آتا ہے اور وحشت ہوتی ہے ـــــ"

(مکتوباتِ آزاد۔ ص ۹۷-۹۸)

اِس واقعہ کا آزاد کے ذہن پر گہرا اثر ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کی پھوپھی

کا انتقال مکان میں آگ لگنے کے باعث ہوا۔ مگر آزاد نے ایسا تذکرہ کہیں نہیں کیا۔

نومبر ۱۸۸۸ء میں آزاد نے تنخواہ میں اضافے کی پھر درخواست دی۔ مگر پرنسپل گورنمنٹ کالج نے لکھا کہ تنخواہ میں اضافہ اس وقت ممکن نہیں۔ آیندہ دیکھا جائے گا۔"

۱۸۸۹ء میں ناظم تعلیمات نے آزاد کو حکم دیا کہ راولپنڈی میں مسٹر پیٹرسن سے ملو اور فارسی قواعد آٹھویں جماعت کے لئے تیار کرو۔ جو آزاد نے تیار کر دی۔

لائیٹنر نے کوششیں جاری رکھیں کہ آزاد گورنمنٹ کالج سے چلے جائیں راولپنڈی سے واپسی پر آزاد نے ناظم تعلیمات کو درخواست دی کہ میری خدمات کو انتظامی محکمے میں بھیج دیا جائے اور مجھے اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا جائے جس کی آسامی خالی تھی اور آزاد ہر طرح سے اُس کے اہل تھے لیکن ڈاکٹر لائیٹنر آزاد کو زیادہ سے زیادہ پریشان رکھنا چاہتے تھے۔ وہ برابر اُن کی درخواستوں کو نامنظور کرتے رہے۔ اتفاقاً اُن دنوں لائیٹنر کا تبادلہ ناظم تعلیمات کے طور پر ہو گیا۔ اُنھوں نے فوراً آزاد کا فائل منگوایا۔ اور لکھا کہ آپ چونکہ ساری عمر محکمہ تعلیم سے منسلک رہے ہیں اس لئے آپ کو عدلیہ سے منسلک کرنا بے کار ثابت ہوگا۔ مگر آزاد ملازمت کے مسائل سے الگ تھلگ اپنے ادبی کاموں میں مصروف

رہے اور ۱۸۸۸ء میں "آبِ حیات" شائع ہو گئی۔

ایک مرتبہ پھر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے آبِ حیات کا استقبال کیا۔ اور کچھ نے مخالفت۔ کہ آزاد نے بعض شاعروں کے حالات کو آبِ حیات میں کیوں نہ شامل نہیں کیا۔

انہی دنوں "نیرنگِ خیال" بھی منظرِ عام پر آئی اور آزاد کی ادبی شہرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

اِن دونوں تصنیفات سے فارغ ہو کر آزاد دربارِ اکبری کے کام میں مصروف ہو گئے، اُن کے بے شمار خطوط میں "دربارِ اکبری" کی مصروفیات کا تذکرہ ہے ــــ "دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ بس دربارِ اکبری کو لپیٹ رہا ہوں ــــ" (مکتوباتِ آزاد ص ۲۰)

آزاد دربارِ اکبری کو سالار جنگ اوّل محسن الملک کے نام معنون کرنا چاہتے تھے۔ مگر سالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس سلسلہ میں آزاد دکن بھی جانا چاہتے تھے، اِن تمام امور کا ذکر آزاد نے اپنے مکتوبات میں جا بجا کیا ہے۔

۱۸۸۸ء میں آبِ حیات کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آیا۔ اس میں آزاد نے بہت اضافے کئے تھے۔ آبِ حیات کا موجودہ ایڈیشن اُسی کے مطابق ہے۔

آزاد انہی دنوں ملازمت کے سلسلے میں بھی کافی مصروف رہے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں ایک نجی خط میں لکھا کہ ــــ "آپ دیکھتے

ہیں کہ یہ علم کی چڑیل تعلیم پنجاب کو ہضم کرتی جا رہی ہے ——" اسی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں آزاد کو اُردو کے طلبا رکے داخلے کا ممتحن مقرر کر دیا گیا اور اس قسم کے کاموں سے آزاد بھاگتے تھے مگر وہ خاموش رہے، کیونکہ حالات کا تقاضہ یہی تھا۔

اسی سال حکومت نے گورنمنٹ کالج کے تمام پروفیسروں کو جو شعبۂ شرقیہ سے متعلق تھے، ایک حکم کے ذریعے اورنٹیل کالج منتقل کر دیا۔ آزاد نے سینٹ کے اجلاس میں اس حکم کی سخت مخالفت کی مگر گورنمنٹ نے آزاد کو اورنٹیل کالج کے شعبۂ اُردو کا صدر بنا دیا اور انھیں اسسٹنٹ پروفیسر عربی و اُردو کہنے کا حکم دیا۔

آزاد اس تبدیلی سے قطعی خوش نہ ہوئے۔ آزاد نے گورنمنٹ کالج میں پندرہ برس گزارے اور ۱۸۸۳ء میں اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے گورنمنٹ کالج میں اُن کا شمار بہت اچھے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آزاد گورنمنٹ کالج سے کیا نکلے کہ اُن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آغا محمد باقر اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:-

"—— پھوپھی کے بعد اُن کی پیاری بیٹی جس کو انھوں نے خود پڑھایا لکھایا تھا، عفوانِ شباب میں انتقال کر گئی۔ یہ آخری صدمہ اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ جب یہ ہوش ربا خبر اُن تک

پہنچی تو اُن کا دماغ بے قابو ہو گیا۔ تجویز ہوا کہ وہ پٹیالے چلے جائیں۔ (ان کی بیٹی رئیس پٹیالہ سید محمد کاظم ممبر کونسل ریاست کی بیوی تھی) وہ نہانے کے لئے غسل خانے میں گئے۔ اور کئی گھنٹے وہیں بیٹھے رہے۔ لاکھ دروازہ کھٹکھٹایا مگر نہ کھولا۔ یہاں تک کہ ریل کا وقت گزر گیا۔ اس صدمے سے اُن کا دماغ معطل ہو کر رہ گیا ——"

آزاد اپنی بیٹی کے انتقال پر پاگل سے ہو گئے۔ سیرِ ایران کے دیباچہ میں آزاد اپنی اس کیفیت کے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ:-

"—— انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ جوان بیٹی کی موت کا تھا۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھا۔ وہ میری تصنیفات میں میرا دایاں ہاتھ تھی۔ اُس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور تصنیفات کا قلمدان اُلٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوش مندوں کو مجھ پر جنوں کا شبہ ہونے لگا۔ پٹیالے اور لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا ——" (سیرِ ایران ص۹۰)

آزاد مجموعی طور پر زندگی کی یک رنگی سے فرار چاہتے تھے۔ اور ملازمت کے دوران بھی انھیں مخالفوں نے سکون نہیں لینے دیا تھا۔ آخر اورنٹیل کالج میں ایک سال گزارنے کے بعد آزاد نے ایران کی سیر کی ٹھانی، جو اُن کے آباؤ اجداد کا وطن تھا جن کے دیکھنے کی تمنا بچپن سے اُن کے دل میں تھی۔

سیرِ ایران

۱۸۸۵ء

آزاد کے ذہن میں ایران کی سیر کا خیال آیا اور انھوں نے تیاری کا آغاز کر دیا۔ ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء کو آزاد نے پنجاب یونیورسٹی کو ایک درخواست دی۔ اُن دنوں ڈاکٹر لائٹنر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ انھوں نے اپنی پرانی وضع داری کو برقرار رکھتے ہوئے آزاد کی درخواست رد کر دی جس کا آزاد کو بہت افسوس ہوا۔

آزاد، لائٹنر کی اس حرکت سے خاصے برہم ہوئے اور اپنا معاملہ گورنر پنجاب سر چارلس کی خدمت میں براہِ راست پیش کر دیا۔ آزاد کی اُن سے اچھی دوستی تھی اور یہ دوستی انجمن پنجاب کے جلسوں میں ہوئی تھی، جب وہ ڈپٹی کمشنر تھے۔ چنانچہ ۱۴ر اگست ۱۸۸۴ء کو شام سوا چار بجے آزاد لیفٹیننٹ گورنر سے ملے۔ اس ملاقات کا خط میرے پاس محفوظ ہے۔ سر چارلس گورنر نے۔ آزاد کی رخصت منظور کر لی یہ رخصت آزاد کو نصف تنخواہ پر ملی۔

آزاد نے رختِ سفر باندھا۔ ۲۳ر ستمبر ۱۸۸۵ء بروز منگل کو شام چھ بجے بذریعہ ریل کراچی روانہ ہوئے۔ آزاد کے پاس دس ہزار روپے کی رقم تھی، جو فقط اس لئے تھی کہ آزاد اس رقم سے وہ نایاب کتابیں خرید کر اپنے کتب خانے میں رکھنا چاہتے تھے، جس کی تعمیر کا خاکہ اُن کے ذہن میں برسوں سے کلبلا رہا تھا۔ آزاد ۲۵ر ستمبر کو کراچی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ایک بحری جہاز گزشتہ روز روانہ ہو چکا ہے۔ ایک ہفتہ مزید جہاز کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کراچی کے قیام کے دوران وہ اپنے مختلف احباب سے ملے۔ جو اُن کے دہلی سے جاننے والے تھے۔

۲ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو آزاد "عربیا" نامی جہاز کے ذریعے، شام ساڑھے چار بجے ایران کے لئے روانہ ہوئے۔

آزاد نے سُن رکھا تھا کہ جہاز میں چکر آتے ہیں اور پریشانی ہوتی ہے۔ احتیاطی طور پر آزاد نے اپنے رختِ سفر میں تربوز، انار، املی اور لیموں کا اچار رکھ لیا تھا۔ ——— آزاد نے فقط اس لئے جہاز کے تھرڈ کلاس میں سفر کیا کہ زیادہ سے زیادہ بچت ہو سکے اور وہ زیادہ سے زیادہ کتابیں خرید سکیں۔ جہاز دس اکتوبر کو ایران کے ساحلی شہر "بوشہر" کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اور آزاد دن کے ڈیڑھ بجے شہر میں داخل ہوئے۔

۱۶ر اکتوبر تک آزاد نے بوشہر میں قیام کیا اور پھر ایک قافلے کے ہمراہ شیراز کے لئے روانہ ہو گئے۔ ۲۶ر اکتوبر کو آزاد شیراز پہنچے۔ اپنے روزنامے اور

لیکچر میں آزاد نے شیراز کا حال کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے وہاں کے مشہور اساتذہ اور ادیبوں، شاعروں سے ملاقات کی وہاں کے فنِ تعمیر اور مختلف کتب خانوں کا معائنہ کیا۔ اور کتابیں خریدتے رہے۔ وہ سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں جاتے اور جس کتاب کا جو ٹکڑا پسند آتا، اُسے فوراً نقل کر لیتے۔

شیراز میں آزاد نے پندرہ روز قیام کیا۔ برف باری کے خوف کے باوجود آزاد شیراز میں مقیم رہے اور اپنی معلومات بڑھانے کا ہر سبب کرتے رہے۔ شیراز میں آزاد نے ایک شخص کے یہاں "گھر بیوہمان" بن کے رہے مگر تین دن بعد ہی اُسے چھوڑ دیا۔ اِس لئے کہ وہ آزاد کے ذاتی کھانے میں، جس کی آزاد ادائیگی کرتے تھے، اپنے رشتہ داروں وغیرہ کو بلا تکلف شریک کر لیتا تھا۔

آزاد نے شیراز سے رختِ سفر باندھا اور اصفہان و تہران کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں موجود شاہ عباسی سراؤں میں بسیرا کیا۔ چار پانچ آنے کا مرغ خریدتے خود پکاتے اور کھاتے۔ میوے آزاد کو کھانے کا بہت شوق تھا۔ یہاں پھلوں کی بہتات تھی۔ بارہ دن کے سفر کے بعد آزاد اصفہان پہنچے۔

پانچ دن اصفہان میں قیام کیا اور آگے کاشان روانہ ہو گئے۔ ۴ دسمبر کو کاشان کے شہر میں داخل ہوئے اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ کاشان سے آزاد قم پہنچے۔ اور امام موسیٰ رضا اور ان کی ہمشیرہ کے مزار پر حاضری دی۔ مختلف قبروں

کے کتبے نقل کئے اور تہران روانہ ہو گئے۔

تہران اُن کا اصل مقام تھا۔ یہاں وہ پہلے ہی دن کتابوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اِس سلسلے میں وہ سب سے پہلے شہزادہ معتمد الدولہ نواب فرہاد مرزا سے ملے۔

شہزادے کی وساطت سے آزاد تہران کے علما اور امراء سے ملے۔ وہ تہران کے وزیرِ تعلیم سے بھی ملے اور نصاب پر بات چیت کی۔ تہران ہی میں آزاد کی ملاقات ایک پارسی سے ہوئی۔ اُس کا نام مانک جی صاحب تھا۔ اُسے تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ اُنھوں نے ایک جلسے میں آزاد کی خدمت میں ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا۔ آزاد تین ماہ تک تہران میں کتابیں جمع کرتے رہے اور مختلف لوگوں سے اس سلسلے میں ملاقات کرتے رہے۔ سردیوں کا موسم آزاد نے تہران میں بسر کیا۔ جب برف پڑ چکی تو آزاد نے مشہدِ مقدس کا رُخ کیا۔

چھ منزلوں کے بعد وہ سمنان پہنچے۔ یہاں اُنھوں نے فارسی کے مشہور شاعر اور فارسی زبان کے محقق مرزا نعیما جندقی کے لڑکے سے ملاقات کی۔ مگر اِس ملاقات سے آزاد کو صدمہ ہوا کیونکہ اتنے بڑے عالم کا لڑکا محقق کی برخی بنا رہا تھا اور اپنے باپ کے بارے میں بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا کہ اُس کے کارنامے کیا تھے۔

آزاد نے یہاں مختصر سے قیام کے بعد اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کیا، اور

دامغان شاہ، بسطام، سبزوار، نیشاپور سے ہوتے ہوئے مشہد جا پہنچے۔
یہاں انھوں نے مدرسوں کو دیکھا، مساجد اور پرانی عمارتیں دیکھیں اور کتب خانوں اور کتب فروشوں کے دوکانوں کے دن رات چکر لگائے اور اپنے علم کی پیاس بجھائی۔ مشہد میں آزاد نے بارہ دن قیام کیا۔ وہ بادشاہوں کی قبروں پر بھی گئے۔ نادر شاہ کے بارے میں آزاد کے تاثرات بہت اثر انگیز ہیں۔ جو سیر ایران کے سفرنامے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

یہاں سے آزاد نے واپسی ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔

ہندوستان کے لئے مشہد سے دو راستے تھے۔ پہلا کراچی سے بندر عباس اور بذریعہ بحری جہاز کراچی واپسی ۔ اور دوسرا ہرات، قندھار سے کوئٹہ کا تھا۔
آزاد نے دوسرا راستہ اپنے لئے منتخب کیا۔ اور ۵ رجب کو ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ خیر آباد سے روانہ ہونے کے بعد رات کو آزاد نیند کے جھونکے میں اونٹ پر سے نیچے گر گئے۔ آزاد سیر ایران میں لکھتے ہیں کہ:۔

——— رات کو میں اونٹ پر سے اونگھتے ہوئے لڑھک گیا۔ سر اور گدی کے بل گرا تھا۔ مرنے میں کچھ باقی نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت کہ بال بال بچ گیا۔ زیادہ تر پشت، دونوں پہلوؤں اور سینے پر صدمہ پہنچا مجھے پھر اونٹ پر ڈال کر لحاف اوڑھایا اور رسی سے کس دیا۔ سب کو خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رسّہ کھول

دیا اور مجھے آواز دی۔ میں نے کہا۔ "تو کیتی" شتربان نے نام لیا۔ مجھے گودی میں اتارا اور بستر پر لٹا دیا۔ تین دن عجیب حال رہا، کھانسنا بھی دکھ دیتا تھا۔ ———"

آزاد جلد ہی تندرست ہو گئے۔ ہرات کے راستے میں جام کا شہر آیا، اور آزاد نے یہاں پہنچتے ہی مولانا جامی کے مزار کا رخ کیا اور فاتحہ پڑھی۔ انھیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ مزار بہت اچھی حالت میں تھا۔

آزاد کے عہد میں ہرات اپنی جوانی اور خوبصورتی کھو چکا تھا۔ یہاں آزاد کا پروانۂ راہ داری دیکھا گیا اور فوراً آگے جانے کی اجازت دے دی۔ قافلے کی تلاش میں دو دن لگ گئے۔ قافلے کے ملنے کے بعد قافلہ سالار سے گفتگو ہوئی تو اس نے بتایا کہ پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔ مگر روزانہ پرسوں پرسوں کرتے اٹھائیس دن بیت گئے۔ ایسے حالات میں آزاد بہت پریشان ہوئے۔ کابلی لوگ بہت نکمی مزاج اور ترش طبیعت کے مالک تھے۔ وہ آزاد سے طرح طرح کے الٹے سیدھے سوال کرتے۔

اس دوران آزاد نے ہرات کے در و دیوار کی سیر کی۔ کوئی چھوٹی کتابوں کی دکانوں پر گئے مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ عمارتوں، مزاروں اور مدرسوں کی سیاحت کی۔ خاص طور پر مسجدیں آزاد کو بہت پسند آئیں۔

ہرات سے خدا خدا کر کے روانگی ہوئی اور قندھار تک کا سفر چھبیس دن میں

تمام ہوا۔ اس سفر میں آزاد سب سے زیادہ پریشان ہوئے۔ کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ اُن کے بوجھ کے خوف سے آزاد جگہ جگہ اپنا ضروری اسباب بھی کم کرتے چلے آئے تھے۔ اب اُن کے پاس کھانا پکانے کا سامان بھی نہیں تھا۔ بہت سی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے لیں تھیں، مگر ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا، اور روٹیاں بھیگ کر سڑ گئیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا روٹیاں پکوا لیتے اور سوکھی روٹی پانی کے ساتھ کھاتے۔ البتہ دوسرے لوگوں کے پاس کھانے پکانے کا سامان تھا۔ مگر وہ ایسے متعصب تھے کہ آزاد کو کسی چیز کے قریب نہیں آنے دیتے تھے کہ وہ ناپاک ہو جائیں گی۔ جگہ جگہ لوگ انھیں پتھر مارتے کہ کافر ہے، مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اگر آزاد کوئی چیز انھیں کھانے کو دیتے تو بخوشی لے لیتے۔

قندھار میں آزاد نے پانچ دن قیام کیا۔ یہاں بھی لوگوں کا انداز اور سلوک ہرات والوں کا سا تھا۔ وہ بار بار سوال کرتے اور پریشان کر دیتے۔

اِن تکلیفوں کے علاوہ بارش سردی اور برف نے بھی آزاد کو بہت زیادہ پریشان کیا۔ کیونکہ اُن کے ساتھ کتابیں تھیں۔ قندھار سے آزاد کوئٹہ پہنچے اور یہاں انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھوں نے ایک چھکڑا کرایہ پر لیا۔ اس پر کتابیں لادیں۔ اور آپ بچھونا بچھا کر کتابوں کی حفاظت کی خاطر اُن پر لیٹ گئے۔ دو دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد وہ رندی پہنچے اور وہاں سے ریل میں سوار ہو کر بخیریت تمام لاہور پہنچے۔ یہ جولائی ۱۸۸۸ء تھا۔

سفرِ ایران کا تحفہ آزاد "سیرِ ایران" کی صورت میں لے کر آئے۔ اس سلسلے میں پہلا لیکچر آزاد نے انجمن ہال لاہور میں دیا۔ اس کا لیکچر کو سننے والوں میں مولانا عبدالرزاق کانپوری بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں جب یہ بوڑھا مسافر ایران کے سفر سے واپس آیا تو دوستوں اور شاگردوں نے مجبور کیا کہ وہ سیر و سیاحتِ ایران پر ایک لیکچر دیں۔ اس لیکچر کی گونج آج بھی میرے کانوں میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزاد ریڈیو پر بول رہے ہیں۔

ایران کے سفر کا دوسرا تحفہ وہ مختصر روزنامچہ ہے جسے پہلی مرتبہ آغا طاہر نے شائع کیا۔ یہ لیکچر آزاد کی افتادِ طبع، ذوق و شوق اور علمی تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ واپسی پر آزاد نے دوبارہ سخندانِ فارس پر نظرِ ثانی کی۔ یہی وجہ ہے سنٹرل ایشیا کے سفر کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں ایران کی سیاحت کے اثرات بھی ملتے ہیں۔

اس سفر کے دوران آزاد جو کتابیں، نادر و نایاب ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے عربی، فارسی کے قلمی نسخے خرید کر لائے، وہ اہلِ ادب کیلئے ایک انمول خزانہ ہیں۔ انھوں نے واپسی پر ایک کتب خانہ تعمیر کرایا۔ جس میں اپنی تمام کتابیں رکھیں۔ بعد میں یہ کتب خانہ (آزاد کی زندگی ہی میں) بند ہو گیا۔ اور آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے یہ تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو "آزاد کولیکشن" کی صورت میں بلا معاوضہ عطا کر دیں۔ یہ کولیکشن آج بھی یونیورسٹی کی لائبریری میں علم کے پیاسوں کا چشمہ ہے۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ جس کو آزاد نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔

ملازمت کا آخری دور اور شمس العلماء کا خطاب

آزاد پھر ایک مرتبہ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وہی یونیورسٹی اور وہی پروفیسر آزاد کا گھوڑے پر سوار ہو کر یونیورسٹی جانا اور گرد طالب علموں کا ہجوم اب ان کا ارادہ یہ ہوا کہ ایک کتب خانہ قائم کیا جائے۔ ۱۸۵۷ء میں آزاد کے گھرانے کا عظیم الشان کتب خانہ تباہ و برباد ہو گیا تھا جس میں گھر پور روایت کے مطابق تقریباً بیس ہزار سے زائد کتابیں اور قلمی نسخے تھے، اور آزاد نے دوبارہ نہری زمین کے حصول کی کوششیں جاری کر دیں۔ ناظم تعلیمات نے آزاد کی یہ درخواست کمشنر خزانہ کو بھیج دی جس میں آزاد کی ادبی تعلیمی کارکردگی اور شخصیت پر ایک حوصلہ افزا نوٹ لکھا۔ (اس کی نقل راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔) ایک طویل گفتگو کے بعد کمشنر نے صاف انکار کر دیا۔ گورنر سے درخواست کی تو جواب آیا کہ وائسرائے نے اس قسم کے عطیات کی ممانعت کر رکھی ہے۔

اس طرف سے مایوس ہو کر آزاد نے اپنی پوری توجہ کتب خانے کی تعمیر پر مرکوز

کر دی۔ حکومت نے اس سلسلے میں آزاد کی پوری پوری مدد کی اور دہلی دروازہ کے باہر (موجودہ سرکلر روڈ) شاہ محمد غوث کی درگاہ کے برابر ایک زمین کا ٹکڑا عطا کیا جس کے چاروں طرف ایک وسیع و عریض باغ تھا۔ کتب خانے کی تعمیر کے سلسلے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں:-

"اس قطعہ زمین پر آزاد نے اپنی نگرانی میں تقریباً دو ڈھائی ہزار روپیہ صرف کر کے کتب خانہ تعمیر کرایا۔ یہ عمارت اب بھی موجود ہے۔ اس کے پیچھے سکونتی مکان ہے اور سامنے کے رخ کوٹھی نما عمارت ہے جس میں کتب خانہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جب کتب خانے کی عمارت تعمیر ہوئی تھی تو وہ بیشتر اوقات اس کی نگرانی میں صرف کرتے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ ابر آسمان پر محیط ہوتا تو پریشان ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتے کہ یا اللہ بارش نہ ہو۔ اگر بارش ہوئی تو کتب خانے کی تعمیر کا کام بند ہو جائے گا۔" کبھی بادلوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے اور کہتے کہ "بادلو اڑ جاؤ، کہیں اور جا کر برسو۔ آزاد کے کام میں کیوں رخنے ڈالتے ہو۔"

ان ہی دنوں جب کتب خانے کی تعمیر کا کام جاری تھا کہ "ریاض الاخبار" کے ایڈیٹر کا گزر آزاد کے کتب خانے سے ہوا۔ وہ آزاد کے تاثرات اور اپنا خیال یوں لکھتا ہے:-

"اس ہفتے ہمارا گزر اُس سڑک پر ہوا جس کے کنارے باغ میں کتب خانۂ آزاد بن رہا ہے۔ پروفیسر آزاد کو سامنے دیکھا۔ اہتمام تعمیر میں عرق ریزی کے ساتھ مصروف ہیں۔ ہم اُن کے پاس گئے اور شکریہ اُن کی توجہات کا ادا کیا۔ جو رفاہِ عام میں وہ کرتے رہتے ہیں فرمانے لگے۔ فقیر کا تکیہ ہوتا ہے۔ اُس میں ایک کنواں ہوتا ہے۔ پانی کا مٹکا بھرا ہوتا ہے۔ مچھیرے میں آپلا سلگتا رہتا ہے۔ کوئی مسافر آنکلتا ہے۔ حقہ بھر کر پیتا ہے۔ پانی سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ فقیر آزاد کا تکیہ علم کا تکیہ ہے۔ کچھ کتابیں ہوں گی قلم و دوات اور کاغذ رکھا ہوگا۔ درختوں کا سایہ بھی ہے۔ چمن ہرے ہیں۔ نالیوں میں پانی جاری ہے۔ راہِ علم کے مسافر آئیں، کتاب سے دل بہلائیں۔ اخباروں سے شگفتہ ہوں۔ فقیر آزاد دعا کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہیں۔"

سر جارج ایچ سن نے جو اُس وقت گورنر پنجاب تھے۔ اِس کتب خانے کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی اور ۱۸۸۸ء کی پنجاب پبلک لائبریری کی رپورٹ میں اِس کتب خانے کا تذکرہ عقیدت اور مسرت کے ساتھ کرتے ہوئے کہا کہ —

"واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ آزاد اہتمام و کمال قلمی کتب پر مشتمل تھا۔ اور ان میں سے بیشتر کتابیں نایاب ہیں۔"

۱۸۸۸ء میں آزاد نے اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم ابرو کی شادی کر دی۔ اِن

تمام مصروفیات کے باوجود آزاد اب بھی دربارِ اکبری کو آخری مرحلوں میں تصنیف کر رہے تھے۔ سخنانِ فارس پر نظرِ ثانی کر چکے تھے۔ دیوانِ ذوق کی ترتیب و تدوین کا کام مکمل ہونے کو تھا۔ آزاد کی مصروفیت کا عجب عالم تھا۔ اور لوگ اُن کے حلیے اور لباس سے اُن کے دیوانے ہونے کا خیال کرنے لگے۔ مگر اُن کا قلم ابھی تک ادب کو نئے خیالات کی خوشبو بخش رہا تھا۔

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر آزاد کو اُن قابلیت اور سیاسی خدمات کے صلے میں "شمس العلماء" کا خطاب اور خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ میری تحقیق کے مطابق شمس العلماء کا خطاب برصغیر میں سب سے پہلے مولانا آزاد کو ملا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہمعصروں میں سب سے پہلے شمس العلماء ہوئے۔ انہی دنوں آزاد پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔

۱۸۹۴ء ہی میں ڈائرکٹر تعلیمات نے اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کی بنا پر حکومتِ پنجاب سے درخواست کی کہ آزاد کو دو ہزار ایکڑ نہری زمین عطا کی جائے۔ یہ کاغذات اِس سے پہلے کہ ضروری کام سے مکمل ہوتے، آزاد کا دماغ اُلٹ گیا۔

دیوانِ ذوق کی ترتیب ابھی جاری تھی۔ آزاد اُس پر غیر معمولی محنت کر رہے تھے، کہ اُن کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اور آزاد عالمِ ہوش سے عالمِ دیوانگی میں داخل ہو گئے۔

۳۰ اگست ۱۸۹۲ء کو وزیر ہند نے آزاد کی پنشن پوری تنخواہ مقرر کی۔ جو ایک طرح سے اُن کی علمی خدمات کا اعتراف تھا۔ یہ حکم میرے پاس موجود ہے۔ آزاد کے لئے اس خاص پنشن کی تحریک گورنر جنرل نے بذاتِ خود کی تھی۔ یہ پنشن انھیں جنوری ۱۹۱۰ء تک ملتی رہی۔ لیکن آزاد نے کبھی بھی یہ پنشن بذاتِ خود وصول نہیں کی تھی۔ انہی دنوں ضلع لاہور کے جج ڈبلیو۔ اے ہیریز ۱۸۵۸ء کی دفعہ ۲۵ کے تحت اپنے حکم مورخہ ۳ مئی ۱۸۹۰ء کے ذریعہ آزاد کو دیوانہ قرار دے چکے تھے۔ آغا محمد ابراہیم اُن کی جائیداد کے متولی اور سردار نرنیدر سنگھ آنریری اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور اُن کی ذات کے نگران مقرر ہوئے۔

آزاد کا عالمِ وارفتگی

مولانا آزاد کے اسباب جنوں کا تجزیہ کرنے سے قبل آزاد کی پوری حیات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ آزاد کی زندگی ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۷ء تک پرسکون نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ فکروں سے خالی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں کچھ ایسے دل سوز واقعات رونما ہوئے جو ناقابلِ برداشت تھے، جنھوں نے آزاد کو شدید ذہنی، روحانی اور مادی اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ وہ ایسے روح فرسا سانحات تھے کہ آزاد زندگی بھر ان کے ماتم دار رہے، باپ کا قتل، شیر خوار بچی کا توپ کے دھماکے سے دم توڑنا، عزیزوں کی جدائی، غریب الوطنی، یہ باتیں کچھ ایسی معمولی نہیں کہ کوئی انسان بآسانی ان کو بھلا سکے۔

پنجاب میں آزاد نے از سرِ نو زندگی کا آغاز کیا۔ جگہ جگہ اور چند کے در بارے جب توقعات پوری نہ ہوئیں تو امید کا دامن تھامے لاہور میں وارد ہوئے۔ ڈاک خانہ میں ملازمت کی، پھر محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد وسطی ایشیا کا

سفر کیا گورنمنٹ کالج میں ملازم ہوئے تو ڈاکٹر لائیٹنر نے ان کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور ہر موقع پر زک پہنچائی۔ انجمن پنجاب میں آزاد نے خوب محنت جانفشانی سے کام کیا۔ مگر وہ بھی غارت ہو گیا۔ آزاد اپنی تمام تر کوششوں اور خواہشوں کے برخلاف اورنٹیل کالج میں تبدیل کر دیئے گئے۔ آبِ حیات کی اشاعت کے بعد بھی اُن کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ اور لوگوں نے اُن پر جانبداری کا الزام لگایا۔ آزاد کے متولہ اولادیں ہوئیں، سوائے آغا محمد ابراہیم اور ایک چہیتی صاحبزادی امتہ السکینہ کے سب آنکھوں کے سامنے ختم ہو گئے اور سب سے گہرا صدمہ تو اُن پر اپنی پیاری بیٹی کے انتقال سے ہوا۔ ان کے انتقال کی خبر سُن کر اُن کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ ان مسلسل صدموں کی یورش، مایوسیوں اور ناکامیوں نے آزاد کو مجنون بنا کر رکھ دیا تھا۔

آزاد کی وفات کے بعد آزاد کی یاد میں بزم اُردو لاہور کا اجلاس ہوا۔ اس جلسے میں مولوی ممتاز علی نے جو آزاد کے حاضر باشوں میں سے تھے، ایک مکمل تقریر کی، موصوف نے آزاد کے جنون پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:۔

عالم دیوانگی کے ظہور سے پہلے بھی مولانا پر روحانی جذبات کا غلبہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا بعارضہ فتق بیمار تھے، آپ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر کی خدمت انجام دیتے تھے۔ رات کے وقت غلبۂ مرض کی وجہ سے شدید تکلیف ہوئی، آدھی رات کے بعد مولوی ممتاز علی کو اپنے مکان پر

بلا بھیجا۔ میں اسی وقت گیا اور تیری حالت دیکھ کر مایوس و پژمردہ خاطر ہوئے بالآخر دوا دارو کا انتظام کیا اور گھر واپس آ گیا۔ صبح دن چڑھے پھر بلا بھیجا۔ دیکھا تو بالکل تندرست تھے۔ مولانا نے کہا کہ میری صحت یابی کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ دل لگا کر سُنو:۔

ایک کرب اور تکلیف کے عالم میں مجھے آسمان پر کچھ آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی، میں نے غور سے سُنا تو اس مجمع میں میرے والد مولوی محمد باقر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوئے۔ ایک اور شخص ایک دوسرے آدمی کو بات سمجھا رہا تھا۔ مگر وہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی میں نے اپنے والد سے کہا یہ کیا معاملہ ہے جو اس کی سمجھ نہیں آتا؟ مولوی محمد باقر نے میرے سے پوچھا کیا تم سمجھ گئے ہو۔ میں نے کہا ہاں سمجھ گیا ہوں، چنانچہ میں نے ان کو اس کا مطلب کچھ اس طرح سمجھایا۔ وہ آدمی جو مسئلہ سمجھا رہا تھا، میرے والد سے پوچھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے؟ انھوں نے جواب دیا بندہ زادہ ہے۔ یہ سُن کر اس نے کہا تو اسے بھی ساتھ کیوں نہیں لے لیتے۔ مگر میرے والد نے کچھ عذر کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے۔ انھوں نے کہا حضرت علیؓ ہیں۔ پھر حضرت علیؓ نے فرمایا تم علاج کیوں نہیں کرتے مولوی محمد باقر نے فرمایا، میں علاج کس طرح کروں؟ پھر حضرت علیؓ نے ترکیب بتائی کہ تم اس کے پیٹ میں اُتر کر اس کی انتڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ٹھیک کر دو چنانچہ اس کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مولوی محمد باقر میرے پیٹ میں اُتر گئے ہیں۔

جب ان کو یہاں دیر لگی تو حضرت علیؓ نے فرمایا کیا کر رہے ہو۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ انتڑیاں ٹھیک کر رہا ہوں۔ آتا ہوں، یہ آواز اس طرح آتی تھی جیسے مولوی صاحب میرے پیٹ میں بول رہے ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے والد سے کہا علاج تو ہو گیا مگر کوئی پرہیز؟ انھوں نے کہا حضرت علیؓ سے پوچھو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، ہمارے علاج میں کسی پرہیز کی ضرورت نہیں۔ مگر میں اصرار کرتا رہا۔ آخر انھوں نے کہا۔ دہی کے ساتھ تربوز کھایا کرو۔ مولوی ممتاز علی نے بتایا کہ اس واقعہ کے بعد اکثر ہم نے مولانا آزاد کے مکان میں تربوز کے چھلکے اور دہی کے دونے پڑے دیکھے۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کو بچپن ہی سے روحانیت سے دلی لگاؤ رہا ہے۔ دیوانگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دیوانگی کا یہ اثر ہوا کہ آزاد نے جو مسلسل محنت کے بعد کتب خانہ بنوایا تھا اسے بند کرنا پڑا۔ اس عالم میں بھی آزاد کو علم سے لگاؤ تھا۔ اور وہ اپنے کتب خانہ میں کسی کے آنے کے روادار نہیں تھے۔ دیوانگی کا دوسرا بڑا اثر بزرگوں اور درویشوں سے ارادت تھی۔ انہی دنوں ایک بزرگ مجذوب سید بدھن شاہ چشتی نواں کوٹ کے قریب آکر اترے۔ آزاد ان کے پاس تقریباً دو سے دن ضرور سلام کرنے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ان کے پاس سلام کرنے آئے تو سید صاحب نے کہا آزاد جاؤ تیرا دلی سے پیغام آیا ہے۔ یہ سنتے ہی آزاد واپس ہو گئے اور پیدل دلی روانہ ہو گئے۔ آخر بہت تلاش کیا۔

ایک عرصہ کے بعد اطلاع آئی کہ آزاد دلی میں ہیں ان کے بیٹے آغا محمد ابراہیم انھیں لے کر دلی سے آرہے تھے کہ راستے میں آزاد جگادھری کے مقام پر چلے سے اتر گئے اور واپس دلی پہنچ گئے۔ آزاد کی دیوانگی بھی عجیب تھی، پانچ منٹ، دس منٹ اور بعض اوقات آدھے گھنٹے تک بہت اچھی باتیں کرتے کہ کوئی ان کی دیوانگی کا گمان تک نہ کر سکتا تھا۔ مگر یکایک دیوانگی شروع ہو جاتی لرگ دھوکے میں رہ جاتے کہ یہی عجیب عالم جنون میں آزاد کے دلچسپ مشغلے تصنیف و تالیف اور ہوا خوری تھے۔ وہ روزانہ صبح میلوں پیدل چلتے تھے۔ کافی کتابیں اسی عالم کی تصنیف ہیں۔ جن میں سے تقریباً نوے مسودے راقم الحروف نے دیکھے ہیں اور میرے پاس محفوظ ہیں۔ بندہ کے خیال میں آزاد کے یہ مسودے آج کے مصنفوں کے لئے شمع ہدایت ہیں۔ آزاد کے ہر کتاب کو نہایت خوش خط اور دیدہ زیب انداز میں لکھا ہے۔ تمام عنوان سرخ روشنائی سے لکھ کر واضح کئے ہیں کانٹ چھانٹ بالکل نہیں ہے۔ سارے مسودے مجلد ہیں اور جلد کی پیشانی پر کتاب کا نام جلی حروف میں لکھا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر اندر بھی نام لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں حاشیہ پر وضاحتی اشارے اور نوٹ بھی ملتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اس عالم میں آزاد کے ادبی ذوق کو سراہے گا اور کئی ایک کتابیں تو ایسی ہیں کہ ان کو پڑھ کر قاری یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ عالم جنون کی تحریر ہے۔

ان کی یہ وارفتگی کم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتی جاتی تھی اور آخر میں تو مجنون ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اس ساری مدت میں قلم دوات ان کے رفیق اور سیر ان کا

مشغلہ خاص تھا۔ اسی زمانے میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ آغا محمد باقر اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"کہتے ہیں ان کے انتقال کو تھوڑی سی مدت گزری تھی کہ ایک دن دروازے پر کہار ڈولی لے کر آئے اور آواز لگائی کہ محمد حسین کوتوال کے گھر سے سواری آئی ہے یہ آواز کہیں مولانا کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ سیدھے اپنے مکان سے نکلے اور بہت تیز رفتاری سے زنانہ مکان میں داخل ہوئے۔ محمد حسین کوتوال شہر کی بیوی آگے آگے تھیں اور مولانا بیوی بیوی کہتے ہوئے پیچھے پیچھے تھے۔ ہر چند گھر کی عورتوں نے کہا کہ یہ وہ نہیں ہیں، وہ تو مر گئی ہیں۔ یہ تو محمد حسین کوتوال کی بیوی ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا تم سب غلط کہتے ہو! یہ تو میری بیوی ہیں۔ میں ان کی شکل ضرور دیکھوں گا۔ تم لوگ مجھے دھوکہ دیتے ہو، کہ وہ مر گئی ہیں۔ اتنے میں وہ بیچاری پلنگوں کے نیچے گھس گئیں۔ کہتے ہیں کہ باوجود سب کے سمجھانے کے انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کو سب کو زبردستی پلنگ کے نیچے سے نکالا اور شکل دیکھی، صورت دیکھ کر کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ" یہ تو واقعی وہ نہیں ہیں۔ وہ تو سچ مچ مر چکی ہیں۔ یہ کہہ کر لاحول پڑھتے ہوئے اپنے مکان میں آ گئے۔"

اسی طرح ایک واقعہ اور سننے میں آیا ہے کہ لاہور ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد بھی شریک مجلس تھے۔ آزاد بھی آئے اور اپنے ہم مکتب سے ملاقات کی بچپن کے دوست تھے، ایک مدت کے بعد ملے تھے۔ دیر تک گفتگو ہوئی۔ اسی اثنا میں مولانا نذیر احمد نے ازراہِ کسرِ نفسی فرمایا

کہ سرسید کی فرمائش پر میرا مضمون ہوگا۔ اگر آپ ایک نظر فرما دیں تو عنایت ہوگی۔ آزاد نے لیکچر طلب کیا اور اسی وقت دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹہ میں لیکچر کا ایک ایک لفظ دیکھ لیا۔ کوئی صفحہ اصلاح و ترمیم سے خالی نہ تھا۔ آخر میں مولانا نذیر احمد سے فرمایا بھئی نذیر تم اردو لکھنا بھی بھول گئے۔" اس کے بعد اٹھے اور چلے گئے۔ گویا یہ ایک آندھی تھی جو آئی اور چلی گئی۔

اسی جنون کے عالم میں آزاد پیدل دلی گئے اور پھر اسی عالم میں علی گڑھ کا طویل سفر کیا۔ آزاد جنون کی حالت میں علی گڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔ نہ جانے دماغ میں کیا آئی ہوگی۔ جب وہ شہر پہنچے تو پاؤں پر ورم آ چکا تھا اور جگہ جگہ زخموں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ آزاد اسی حالت میں سیدھے سرسید کے مکان پر گئے اور ملازموں سے کہا کہ جاؤ کہو کہ آپ کی ملاقات کو لاہور سے آزاد آیا ہے۔ سرسید آزاد کا نام سنتے ہی حیران ہوگئے اور جا کر دیکھا تو واقعی محمد حسین آزاد تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ جاتے ہی آزاد نے سرسید سے کہا معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ سرسید نے انکار کیا، صرف میری ملاقات کے لئے یہ تکلیف اٹھائی، کہا نہیں، بلکہ میرے پاس ابوالفضل کی روح آئی تھی۔ میرے اور ابوالفضل کے درمیان دیر تک اکبر کے نئے مذہب پر مناظرہ ہوا۔ پھر آزاد نے اسی تفصیل کے ساتھ ابوالفضل کی تقریر اور اپنے جواب سنائے۔ ایک ہفتہ کے بعد سرسید نے اپنے خادم کی حفاظت میں آزاد کو لاہور روانہ کیا۔

آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد بیان کرتے ہیں کہ مولانا آزاد نے اسی عالم میں میری سب سے بڑی دو بہنوں کو لکھنا پڑھنا اور ایک عزیزہ کو قرآن پاک باقرأت پڑھنا سکھایا۔ انھیں اپنے پوتے پوتیوں سے بہت محبت تھی۔ کسی کے رونے کی آواز آتی تو فوراً بے قرار ہو جاتے۔ اور باہر آکر شور مچاتے کہ یہ لوگ میرے بچوں کو مار ڈالیں گے اگر کوئی بچہ روتا ہوا ان کے پاس چلا آتا تو غصّے کے مارے آپے سے باہر ہو جاتے۔ اور اکثر لکڑی اٹھا کر زنان خانے کی طرف دوڑتے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ مارنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی بچے کو گود میں اٹھا کر خوب پیار کرتے بازار لے جاتے اور اکثر کسی نہ کسی بچے کو گود میں اٹھائے، اکبری منڈی میں گھومتے نظر آجاتے تھے۔

آزاد کے ایک شاگرد نذیر فراق لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۹ء میں مجھے خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت کر لینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ مولانا اس جہانِ فانی سے رحلت کر جائیں اور پھر یہ آنکھیں آخری دیدار کو بھی ترس جائیں۔ میں اُن کے پوتے آغا محمد یوسف سے ملا اور بتایا کہ میں آپ کے دادا جان کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ وہ مولانا کے پاس لے گئے۔ مجھے دیکھ کر مولانا نے فرمایا، تم کون ہو؟ میرے نام بتانے پر فرمایا، بھئی میں نے تمھیں نہیں پہچانا۔ میں نے بتایا کہ آپ کا شاگرد ہوں۔ فرمایا اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں لے آؤ۔ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھا۔ گرم تو نہیں البتہ ٹھنڈی مل گئیں۔ میں نے جا کر سامنے رکھ دیں۔ ایک جلیبی اٹھائی اور فرمایا میرے دانت ہلتے ہیں تم کھاؤ۔ میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ میں آغا صاحب کے ساتھ

آکر چھاتک میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا چلے آرہے ہیں، اور آتے ہی فرمایا۔ بھئی تم کب دلی سے آئے۔ واللہ میں نے تمھیں اس وقت پہچانا نہیں تھا اور بیٹھ کر مسکرانے لگے، میں نے کہا مجھے پہچان لیا۔ فرمایا تمھارا نام سید نامر نذیر ہے، میں بہت خوش ہوا۔ میں نے حضرت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ایک تازہ سلام سنایا۔ جو شعر پسند آتا خوش ہو کر داد دیتے اور باقی پر کچھ نہیں کہہ دیتے۔ آخر میں فرمانے لگے، بھئی تمھارا سلام خوب ہے مگر میں نے کچھ نہیں مصرعوں کی بندش کے لحاظ سے کہا تھا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے، کبھی بے ڈھنگے پن کے ساتھ بھی گفتگو کرتے اور بہت کچھ کہہ جاتے، پھر یکایک اٹھے اور بازار کی طرف چل دیئے۔ پھر کبھی آزاد کا دیدار نصیب نہ ہو سکا۔

ؤ

کتاب کی حفاظت کریں

آزاد کی وفات

۱۹۱۰ء

آزاد نے اپنی پوری زندگی میں ایک تو تکلیفیں اور مصائب بہت برداشت کئے اور دوسرے انھیں اپنی زندگی ہی میں شہرت بہت ملی۔ لیکن شہرت کے ساتھ ساتھ آخری عمر میں تکلیفیں اور بڑھتی گئیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس برس عالمِ وارفتگی میں بسر کیے۔ لیکن تصنیف و تالیف پھر بھی اُن کے ساتھ رہی۔ اس بیس برس کے دور میں آزاد نے فلسفہ، نفسیات اور مختلف مسائل پر، یعنی جو بھی اُن کے دماغ میں آتا رہا، اس پر ۸۹ رسائل لکھے۔ جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس وارفتگی اور ان رسائل کے تجزیہ پر میری کتاب "محمد حسین آزاد کا عالمِ وارفتگی" ملاحظہ کیجئے۔

انتقال سے تقریباً چھ مہینے پہلے بواسیر کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی اور مسلسل خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری بڑھتی گئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ محض چائے پیا کرتے تھے۔ ایک مہینہ اسی حال

میں گزرا۔ جسم خشک ہو گیا۔ پیٹ کمر سے لگ گیا۔ اور آزاد سوکھ کر ڈھانچہ ہو گئے یہاں تک کہ محرم سے چائے پینا بھی چھوڑ دی۔

آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب تھی کہ ۸۰ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ اور مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

یہ خبر آناً فاناً شہر میں ہر طرف پھیل گئی۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ مولانا کے عقیدت مند جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چونکہ صبح کو عاشورہ تھا۔ اس لئے قرار پایا کہ اُس دن دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک روز اور انتظار کیا گیا۔ تاکہ وہ لوگ بھی جنازے میں شریک ہو سکیں جو لاہور سے باہر ہیں۔

اس عرصے میں دفن کرنے کے مقام کا فیصلہ ہوا۔ کمشنر پنجاب سے عمائدین شہر نے درخواست کی کہ مولانا کو گامے شاہ کے قریب جسے کربلا بھی کہتے ہیں۔ دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ مقام مزار داتا گنج بخش کے پہلو میں ہے۔ اور مولانا کو داتا گنج بخش اور حضرت گامے شاہ سے کمالِ ارادت تھا۔

تیسرے دن جنازہ اٹھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ساتھ تھے۔ اس دن لاہور کے تمام سرکاری دفاتر اور سرکاری و غیر سرکاری مدارس اور کالج بند تھے اور ہزارہا لوگ آزاد کے جنازے میں شریک ہوئے۔

آزاد کے جنازے میں مولانا شبلی نعمانی بھی شریک ہوئے۔ وہ آزاد کے جنازے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور بغل میں ایک موٹی

سی کتاب تھی۔ کسی نے پوچھا۔ مولانا یہ کیا کتاب ہے۔ مولانا شبلی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ــــ "جس کا یہ جنازہ جاتا ہے، اُسی کی کتاب "آبِ حیات" ہے ــــ"

آزاد مرحوم کے اکلوتے بیٹے آغا محمد ابراہیم جو اُس وقت لاہور ہائیکورٹ کے جج تھے۔ اُنھوں نے سوئم کی فاتحہ کے لئے تمام شہر لاہور کو مدعو کیا۔ اور کہتے ہیں کہ فاتحہ کا لنگر موچی دروازے کے باغ میں کھلا تھا۔ اکبری دروازے لیکر لوہاری دروازے تک ایک عجیب گہما گہمی کا عالم تھا۔ اور ہزارہا دیگیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ شہر کے تمام امراء اور غرباء کو کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد آغا محمد ابراہیم نے کئی ہزار روپے صرف کر کے آزاد کا مقبرہ تعمیر کرایا جس کے لئے سنگِ مرمر آگرہ سے منگوایا گیا۔ اندر سے تمام مقبرہ اُسی سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے، اُس پر سونے کا کلس بھی لگوایا۔ جو افسوس کہ چند برس ہوئے چوری ہو گیا۔ آزاد کا مقبرہ احاطہ گامے شاہ میں ہے۔

یوں تو آزاد کی وفات پر سینکڑوں کے حساب سے تاریخِ وفات کہی گئیں، مگر آزاد کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے، اُس پر خلیفہ سید محمد متین کی کہی ہوئی فارسی میں تاریخِ وفات کندہ ہے۔ مگر جو تاریخِ وفات آزاد کے ہمعصر اور دوست مولانا الطاف حسین حالی نے کہی وہ آج بھی ادب کا سرمایہ اور آزاد کو سچا خراجِ عقیدت ہے۔ ملاحظہ کیجئے:-

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا — جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ — جو اُس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا، مدتوں تحقیق کی خاطر — چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہلِ قلم میں — تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں — ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق — بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شبِ عاشور کو تھی جس کی تمنا — آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اُسے رب کا

تاریخِ وفات اُس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ "ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا"

۱۳۲۸ھ

آزاد کی شخصیت

بقول آغا محمد باقر نبیرہ آزاد، آزاد کی وضع قطع کچھ یوں تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی ناک، گھنی اور گول داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، چوڑا اور بھرا بھرا سینہ۔ آزاد کا لباس بالکل مولویانہ اور قدیم وضع کا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ "برکے پائینچے" کا پاجامہ اور لٹھے کا مغلئی گریبان کا کرتا پہننے کے عادی تھے۔ ادھیڑ عمر میں ایک آدھ مرتبہ بوٹ بھی پہن لیا کرتے۔ لیکن عام طور پر سلیم شاہی جوتی پہنتے تھے۔ گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا پہن کر اس پر سفید نین سکھ کا چغہ، چوگوشیہ ٹوپی تن زیب کرتے اور اس پر سفید صافہ بائیں جانب سے باندھتے تھے۔ سفید جرابیں پہننے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے جرابیں ہمیشہ سفید ہی ہوتیں۔ قدیم وضع کے مطابق گلے میں سفید لٹھے کا رومال بھی باندھتے تھے۔

سردیوں میں پاجامے کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر ریشم کی ڈوری کا بند باندھا کرتے تھے۔ اگر زیادہ سردی ہوتی تو کشمیرے کی نیم آستین پہنتے۔ سخت سردیوں میں روئی کا

کوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ ورنہ آستین پر فرغل پہنتے۔ سر پر سفید یا فاختائی رنگ کا کشمیری صافہ باندھتے۔ پاؤں میں وہی سفید آدنی جرابیں اور وہی جوتا ہوتا۔ چغہ بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ شاید کسی شخص نے اُن کو اس لباس کے علاوہ کسی دوسرے لباس میں نہیں دیکھا ہو گا۔ جب بھی گھر سے نکلتے اسی لباس میں نکلتے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ عالمِ وارفتگی کے دور میں جراب پہننا بند کر دیا تھا۔

لباس کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ آزاد طہارت کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ اور روزے نماز کے پابند تھے۔ وارفتگی کے زمانے میں روزے ترک کر دیئے تھے مگر نماز اکثر پڑھتے تھے۔

آزاد اپنی سالگرہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مناتے تھے۔ سالگرہ کے دن خاص طور پر نہاتے دھوتے، شکرانے کی نماز ادا کرتے، صدقہ دیتے۔ سات قسم کے پھلوں اور مالیدے پر نیاز دی جاتی۔ اور ایک تھال میں یہ چیزیں رکھ کر اس میں چراغ روشن کر کے شام ڈھلے دریا میں بہا دیتے۔ اُن کی پھوپھی، جنھوں نے آزاد کو پالا تھا، اُن کے پاس سالگرہ کا قلادہ رہتا تھا وہ اُس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر گرہ لگاتی رہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جب غدر ہوا اور سب خاندان گھر سے نکلا تو آزاد کی پھوپھی نے بھرے گھر میں سے فقط وہی سالگرہ کا قلادہ اُٹھا کر اپنے دوپٹے کے آنچل سے باندھ لیا۔ کیونکہ وہ سالگرہ کے قلادہ کا ضائع ہونا بڑی بدشگونی سمجھتی تھیں۔ لیکن عالمِ وارفتگی میں آزاد کو سالگرہ کا احساس نہیں رہا تھا۔

آزاد نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ شروع میں دہلی اور پھر لاہور میں بسر کیا۔ کچھ عرصہ مستی دروازے میں رہے۔ پھر کچھ عرصہ بنگلہ ایوب شاہ شیرانوالہ گیٹ اور اپنے کتب خانے کے ملحقہ مکان میں رہے۔ آخری عمر میں اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے تعمیر کردہ مکان واقع آزاد بازار اکبری منڈی میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان آج بھی ہمارے پاس ہے اور محفوظ ہے۔ یہ مکان ۱۹۰۱ء میں مکمل ہوا۔

آزاد کی شادی آغائی بیگم سے ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۰۰ء میں انتقال کر گئیں۔ آزاد کے یہاں کل سولہ بچے پیدا ہوئے۔ لیکن صرف ایک بیٹی امت السکینہ اور ایک بیٹے آغا محمد ابراہیم زندہ بچے۔ آغا محمد ابراہیم پہلے امرتسر میں پھر لاہور ہائیکورٹ میں جج رہے۔ آزاد کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ جس کا اُن کے خطوط سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور عالم وارفتگی کی تحریروں میں جا بجا بچوں کے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔

آزاد کا حلقۂ احباب خاصہ وسیع تھا۔ منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد تو اُن کے ہم جماعت تھے۔ حالی اور سرسید سے بھی اُن کے گہرے مراسم تھے۔ آزاد کے احباب میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے۔ وہ دوستوں سے تکلف برتنے کے قائل نہیں تھے۔ اُن میں شگفتہ مزاجی اور سادگی بہت تھی۔ آزاد کا شمار لاہور کے مشاہیر اور علماء میں ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ نہایت سادہ مزاج تھے۔ جب آزاد پیادہ پا عالم جنون میں لاہور سے دہلی پہنچے تو منشی ذکاء اللہ

نے دوستی کا پورا حق ادا کیا۔ اسی طرح جب آزاد لاہور سے پیدل علی گڑھ پہنچے تو سرسید نے بھی آزاد کو پوری احتیاط سے لاہور پہنچا دیا۔ میجر بلگرامی سے بھی اُن کی بہت دوستی تھی۔ آزاد اپنے شاگردوں سے بہت اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سارا پنجاب اُن کے شاگردوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا تعین کرنا خاصا مشکل ہے۔ ان کے نامی گرامی شاگردوں میں جسٹس شاہ دین گرامی شاعر اور ممتاز علی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے محبت سے پیش آتے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے یہاں تک کہ روپے پیسے کا مسئلہ اور رہائش تک مہیا کرتے اور اس کے لئے خود پریشان ہو جاتے۔

لالہ دُنی چند اُن کے پیارے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ ایک شاگرد کو دوسری شادی کے سلسلے میں جو خط لکھتے ہیں اُس کے لفظ لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"—— خدا کا شکر ہے کہ تمہارا بھوت اُتر گیا اور تم نے اپنے ماں باپ کے فرمانے سے اپنا گھر پھر بسا لیا۔ یہ جوانی دیکھو اور یہ ستم دیکھو۔ برسوں سے رنڈوے بیٹھے رہے۔ چلو اچھا ہوا کہ دوسری بیوی بھی پہلی بیوی کی طرح تمہاری خاطر خواہ مل گئی اور پھر چپڑی اور دو دو۔ دوسری بھی سیدانی —— خاتونِ جنت کے طفیل سے

یہ بیوی تمھیں سازگار ہو اور تم پھلو پھولو ——"

(مکتوب آزاد ص۹۹)

آزاد کے ادبی ملازمہ میں شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور سید ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ فراق نے اپنے اُستاد آزاد کے نامکمل ڈرامے "اکبر" کی تکمیل بھی کی۔

انسان کی حیثیت سے آزاد شگفتہ طبیعت اور سادہ مزاج تھے۔ دہلی کی بربادی کے باوجود اُن کی خوش مزاجی اور خوش دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ہمیشہ غم کو ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ لیکن مایوسیوں اور ناکامیوں نے اُن کے اعصابی نظام کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر بھی آزاد طلبہ، دوستوں، جلسوں انجمنوں میں ہر جگہ ممتاز اور منفرد نظر آتے تھے۔ یہی عمل ان کی تصانیف میں خود کلامی کی صورت میں نمایاں ہے۔

آزاد کی شخصیت کا دوسرا پہلو اُن کی انکساری اور درگزر ہے۔ وہ ہر ایک سے تپاک کر ملتے تھے۔ ہر ایک کی مدد کے لئے تیار رہتے تھے اور اگر دعوے کے باوجود بھی کسی ناگزیر وجہ سے ناکام ہو جاتے تو شرمندہ ہو جاتے۔ وہ انتقام کی بجائے درگزر سے کام لیتے۔ ہم اُن کی حیات میں دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے اپنے کسی مخالف کو کوئی جواب نہیں دیا۔ یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ وہ اس چیز کے قائل تھے کہ اپنا پندارِ محبت مجروح ہو جائے مگر دوسرے

کو تکلیف نہ ہو۔ شاید اسی لئے آزاد نے بہت زیادہ مصائب جھیلے۔

کتابوں سے آزاد کو عشق کی حد تک پیار تھا۔ اُن کی فراہمی کے لئے انھوں نے ہر تکلیف اور پریشانی برداشت کی۔ سیرِ ایران اس کی ایک مثال ہے۔ اگر اگر کوئی کتاب نہ مل سکتی یا نایاب ہوتی تو وہ اُسے نقل کر لیتے تھے۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ آزاد کو سکے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ ایک مرتبہ اُن کے دو تین سو سکے گم ہو گئے، اُس کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے اس شوق سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرے پاس آزاد کے جمع کئے ہوئے سات سو سکے آج بھی موجود ہیں۔ جن میں سب سے قدیم سکہ ایک ہزار سال پرانا ہے۔

لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں آزاد کی خاص عادت یہ تھی کہ، جب وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تو کاغذ قلم اپنے پاس رکھتے۔ جہاں کہیں کوئی چیز پسند آئی نوٹ لکھ لیتے۔ تصنیف و تالیف کا کام نصف شب کے بعد شروع کرتے اور صبح تک لکھتے رہتے۔ لکھنے میں کاٹ چھانٹ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھتے۔ اُن کے مسودے آج بھی اس چیز کے گواہ ہیں۔ یعنی آزاد خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف رہتے

آغا محمد باقر اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ غدر کے زمانے میں اُن کے ایک سکھ دوست نے انھیں ایک دری دی تھی۔ یہ اُسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زمین پر یہ دری بچھا دی جاتی تھی۔ سردیاں ہوتیں تو اُس پر ایک پتلا سا گدیلا ہوتا۔ اور اس پر سفید چاندنی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے لیمپ، پہلو میں کشمیری قلمدان،

اس کے برابر میں ایک تھال، جس میں مختلف طرح کے قلم اور مختلف رنگوں کی روشنائیاں پنسلیں ہوتیں، اور ایک طرف تھوڑی سی چھالیہ بھی پڑی رہتی جب جی چاہتا، دو چار دانے منہ میں ڈال لیتے ——"

آزاد تحریر میں حسن کے بہت قائل تھے مختلف رنگوں کی روشنائیاں اور پنسلیں استعمال کرتے اور خوش نویسی کا خیال رکھتے۔ عالم وارفتگی کی تحریریں عمدہ کتابت کا بہترین نمونہ ہیں۔ سطریں سیدھی، حروف واضح اور روشن عبارت لکھتے تھے۔ اُن کا یہ انداز عالم جنون میں بھی برقرار رہا۔ وہ انہی تحریروں کو ایک مصور کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُس کی نوک پلک سنوارتے رہتے تھے۔

گورنمنٹ کالج آنے جانے کے لئے آزاد کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ اُن کے ایک شاگرد کے بقول اُردو کی پہلی کتاب میں "مولوی صاحب کا گھوڑا" یہی تھا۔ تاریخ گورنمنٹ کالج میں لکھا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ گھوڑا ان کے پیچھے پیچھے آتا تھا۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کالج جاتا کرتے تھے۔ دائیں بائیں طالب علم ہوتے اور وہ اُن سے علمی اور ادبی باتیں کرتے جاتے تھے۔ اگر کسی نے اپنے سبق کے بارے میں پوچھنا ہوتا تو یہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ امتحان کے دنوں میں طالب علموں کا ایک غول اُن کے ساتھ چلتا تھا۔ وہ آزاد سے سوال کرتے اور آزاد اُن کو جواب دیتے۔ آزاد نے اُردو کی پہلی جماعت کی کتاب میں "مولوی صاحب کا گھوڑا" لکھ کر اپنی شخصیت کو بے مثال انداز میں زندہ

کر دیا ہے۔

آزاد کی عادت تھی کہ وہ سرِ شام ہی کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ اور اُس کے بعد دیر تک ٹہلتے رہتے تھے۔ کھانوں میں اُنھیں پلاؤ، کباب اور متنجن بہت مرغوب تھا۔ پھلوں میں انگور، آم، سیب اور تربوز بہت پسند کرتے تھے۔ بیدانے کے موسم میں روزانہ صبح سیر ہو کر بیدانہ کھایا کرتے تھے۔ کھانے میں وہی شوق سے کھاتے تھے۔ شب برات آتی تو کہتے کہ میری فاتحہ شب برات کو پلاؤ پر دیا کرنا ——"

آزاد اثنا عشری گھرانے میں پیدا ہوئے اور اُنہی معتقدات پر قائم رہے۔ لیکن مذہب کے سلسلے میں وہ تنگ نظر نہیں بلکہ روادار تھے۔ اِس کی وجہ آزاد کی تربیت ہے۔

آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ آزاد امام حسین کی مجالس میں سلام و نوحہ بھی تحت اللفظ میں پڑھا کرتے تھے۔ لاہور میں نواب ناصر علی کی حویلی میں سالانہ مجلس عزا ہوتی تھی۔ وہاں عشرے کی آخری راتوں میں ایک مرتبہ اپنا کلام پڑھ کر سعادت دارین حاصل کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دو مرتبہ اُنھوں نے عالم وارفتگی میں بھی مجالس عزا میں سلام پڑھا تھا۔

اگر آزاد کی شخصیت کو ان حالات اور مسائل کے آئینے میں دیکھا جائے تو آزاد کو درشت صفت ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نہیں۔ آزاد ان حالات میں رہ کر

بھی خوش اور صابر رہے۔ آزاد ایک "سیلف میڈ" شخصیت تھے۔ یہی اُن کی سب بڑی اور آفاقی صفت ہے۔

آزاد کا فن

تخلیقی عمل کے بعد تخلیق کے امتحان کا مرحلہ سب سے اہم ہے۔ ہر فنکار کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا تخلیقی عمل، اظہار اور ابلاغ کے تاثرات سے بھرپور ہے اور اپنے اندر صداقت کو سموئے ہوئے ہے۔ وہ واضح تخلیقی عمل ہے جس سے جدید تخلیق کے دروازے بند نہ ہوں گے بلکہ کھلیں گے۔ اس تخلیق کا امتحان سب سے پہلے خود تخلیق کار کرتا ہے؛ گویا یہ خارجی مرحلہ ہے۔ یہاں پر ایک تخلیق کار ایک قاری کا روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔ لیکن یہ قاری غیر معتبر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے اس مرحلے سے واقف ہوتا ہے جس سے گزر کر اس کی تخلیق اس کی ذات سے گزر کر ایک دوسرے حصے تک سفر طے کرتی ہے فقط اس لئے یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے نہیں کر سکتا۔

تخلیقی عمل کی یہ واردات ہر ادیب پر وارد ہوتی ہے، وہ سب سے پہلے اپنی ذات کو منکشف کرتا ہے اور پھر ایک قاری کے سراپے میں اُبھرتا ہے۔ گویا

ہر اعتبار سے اندرونی طور پر ابھرنے والا مصنف، کسی بھی تخلیق کے لئے اچھا مصنف ثابت نہیں ہوتا۔ اس مرحلے کے لئے اور اس پرکھ کے لئے تخلیق کار اور تخلیق کے درمیان ایک مناسب فاصلے کی ضرورت ہے۔ اسی قدر میں بعض تخلیق کار ایسے بھی ہوتے ہیں جو تخلیق کو تمام تعصبات سے بلند ہو کر پرکھتے ہیں۔ اور اگر تخلیق میں کوئی سچائی کا عنصر ہو تو اُسے بآسانی پہچان لیتے ہیں۔ ان کی حیثیت اُن ناقدینِ ادب کی سی ہے، جنھیں بصارت اور بصیرت دونوں حاصل ہوں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیقی عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرض کیجئے کہ آپ اندھیری رات میں بجلی کے کسی قمقمے کی طرف خراماں خراماں بڑھے چلے جا رہے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ آپ کا طویل سایہ آپ کے تعاقب میں ہے۔ مگر جیسے جیسے آپ قمقمے کے قریب پہنچیں گے، یہ سایہ چھوٹا ہوتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب آپ قمقمے کے عین نیچے پہنچیں گے تو یہ سایہ آپ کے قدموں میں گم ہو چکا ہوگا۔ اس کے بعد جب آگے بڑھیں گے تو یہ سایہ لپک کر آپ کے قدموں میں سے باہر آ جائے گا۔ اور اب آپ کے پیچھے آنے کے بعد آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا۔"

اُردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد ایک تخلیق کار تھے۔ عمل کے مندرجہ بالا سائے اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سائے مولانا آزاد کے پیش پیش تھے یا پیچھے؟ آزاد کے اندر کے تخلیقی انسان کا تجزیہ اس سلسلے میں اشد ضروری ہوگا اور عالمِ وارفتگی کا دور بھی آزاد کے اندرونی

تخلیق کار کی وضاحت کر سکتا ہے۔ لیکن میں آزاد کے تخلیقی عمل کا جائزہ، آزاد کی پہلی جماعت کی کتاب سے کر عالمِ وارفتگی تک لوں گا اور اس میں مختلف واقعات بھی شامل ہوں گے، جس سے آزاد کے تخلیقی انسان کی نشاندہی بخوبی ہو سکے گی۔

"ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے" ——— کشتی صاف ہوئی، کچھ جھگڑا نہ رہا ——— تو ——— لوگ تالیاں بجائیں گے، واہ واہ کا شور مچائیں گے، جو میاں، پچھاڑیں گے وہ چھوٹے نہ سمائیں گے اور جو پچھڑیں گے وہ شرم کے مارے سر نہ اٹھائیں گے۔"

تخلیقی عمل کے اس مرحلے کو آزاد نے ساٹھ برس کی عمر میں طے کیا۔ وہ خود اس کے متعلق لکھتے ہیں ——— "بچوں کے یہ کھلونے تیار ہوئے ہیں۔ بڈھے ہو کر بچہ بننا پڑا ہے۔" گویا آزاد نے خود کو واضح کر دیا کہ اس کے اندر کا تخلیقی انسان اب ساٹھ برس کی عمر میں بڑی مشکل سے بچوں کی نفسیات اور ذہنی باریکیوں کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکا۔ لیکن یہ آزاد کی کسرِ نفسی ہے جس طرح کی مقبولیت آزاد کی ان پرائمری جماعت کی ریڈروں نے پائی۔ وہ سب کے سامنے ہے۔

تخلیق کے یہ مرحلے ان کی زندگی کا سب کچھ تھے۔ آزاد ایک سطر لکھنے بیٹھتے تو کئی کئی مرتبہ اس کو قلم زد کرتے اور بالآخر ایک ایسی سطر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے

جوان کو بھی پسند ہوتی اور قاری کو بھی۔ اُن کے خطوط بھی اِس عمل کے شاہد ہیں اور آزاد کی تصنیفات کے تمام قلمی مسودے (جو میرے پاس محفوظ ہیں) اس نقاشی کے مظاہر ہیں۔ مسودوں میں جگہ جگہ آزاد ایک سطر لکھتے ہیں اور بار بار قلم زد کر دیتے ہیں۔ اگر بہت زیادہ کاٹ چھانٹ ہو جائے تو چیپیاں لگا کر اُسی قلم زدہ عبارت کو دوبارہ اسی تخلیقی معیار پر لانے کی کوشش کرتے جو ان کی ذہن سے چپکی ہوئی بے قرار ہوتی۔

اسی طرح آبِ حیات میں امیر خسرو کے حال میں غزل کی حقیقت بیان کرتے ہوئے آزاد نے وہی طریقہ اختیار کیا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ لیکن اس کی بنیادی باتیں اشد ضروری ہیں۔ میں نے آبِ حیات کے مسودے میں ایسے ہی عمل بے شمار دیکھے ہیں۔ بہر حال ایک چیپی لگی تھی، اس کے اوپر ایک عبارت غزل کی تفصیل میں درج تھی۔ میں نے چیپی کے نیچے کی عبارت پڑھنے کی کوشش کی۔ جو عبارت سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی۔

"—— اوّل قافیے کے ساتھ مضمونِ عاشقانہ اور سلسلہ اشعار کا آیا جسے غزل کہتے ہیں ——"

لیکن مولانا نے اِس عبارت کو مکمل اور تفصیلی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اس پر گوند سے ایک کاغذ چپکایا اور اس پر جو عبارت لکھی وہ اس سے کہیں زیادہ مرصع، واضح اور آسان تھی، انھوں نے دوبارہ لکھا۔

اوّل مضامینِ عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے "غزل

کہتے ہیں۔ وہی قافیے یا ردیف اور قافیے کی پابندی۔ اسی طرح اوّل مطلع یا کئی مطلع۔ پھر چند شعر آخیر میں مقطع اور اس میں تخلیق کا آئین۔"

آزاد کا اندرونی تخلیقی انسان یا آزاد کا ہمزاد تخلیقی عمل کے دوران ایسی کند چھینکے کا بخیہ آرزو مند رہا ہے جس سے وجود میں آنے والے عمل جدیدیت سے بھرپور ہوں جس سے ابھرنے والے لفظ کا "امیج" تابناک ہو۔ لفظ کی تصویر کا منفی رخ ہمارے سامنے نہ آئے بلکہ مثبت اندازِ فکر کا امیج سامنے آئے۔ آزاد لفظ کے اس امیج کی تلاش میں ایک مضمون کو پانچ پانچ مرتبہ لکھتے ہیں ہر مرتبہ اور ہر دوسرے مضمون میں لفظ ایک نیا اور معنی خیز امیج لے کر سامنے آتے۔ الفاظ کی یہ سحر نگاری آزاد کے فنِ تحریر کا جمال ہے۔ وہ لفظ کے امیج کو ابھارنے اور اپنے سامنے چلنے پر مجبور کرتے ہیں اور الفاظ ان کے آگے ہاتھ باندھے سائے کی طرح، قدم سے قدم ملائے چلتے ہیں، الفاظ کی تراش خراش تخلیقی عمل اور فن کی ترقی اور مثبت اندازِ فکر کی طرف وضاحت سے اشارہ کرتی ہے۔ تخلیقی عمل اور فن کا اظہار جس طرح سے آزاد میں جلوہ گر ہے، وہ کسی دوسرے ادیب میں نہیں ہے۔ آزاد نے عالم و ارفتگی میں تخلیق کا دامن نہیں چھوڑا وارفتگی سے پہلا دور آبِ حیات سے دربارِ اکبری اور دیوانِ ذوق تک کا دور ہے۔

دربارِ اکبری کسی حد تک مورخ کے تنقیدی عمل سے خارج ہے لیکن تخلیق کا سفر تمدنی حقائق میں جس شخصیت جان ڈالی ہے اس کا مظہر فقط لفظ کا امیج ہے دربار

اکبری کے ایک اقتباس سے تخلیقی عمل کے امیج کی وضاحت بخوبی ہو سکتی ہے، مولانا آزاد دربارِ اکبری میں تلمیح طراز ہوتے ہیں۔

"——— میرے دوستو! وہ ملک تو دنیا میں ہی نہیں ہے۔ کیونکر لکھوں کہ تمھارے تصور میں تصویر کھینچوں، یہ عالم ہے کہ چاروں طرف پہاڑ، درختوں کا بن، گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بمشکل چل سکیں۔ راستہ ایسا کہ پتھروں کے اتار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ اسی کو سڑک سمجھو گھوڑوں ہی کا دل ہے، انھیں کے قدم ہیں کہ چلے جاتے ہیں کبھی دائیں پر کبھی بائیں پر، کہیں دونوں طرف کھڈ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں ادھر اُدھر ہوا، لڑھکا اور گیا، یہ عالم ہوتا ہے، نفسی نفسی پڑی ہوتی ہے، ایک بھائی لڑھکا جاتا ہے دوسرا بھائی دیکھتا ہے اور آگے ہی قدم اٹھاتا جاتا ہے، چلتے چلتے ذرا کھلا آسمان اور کھلا میدان آیا تو سامنے ایک دیوار پہاڑوں کی معلوم ہوتی ہے، جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔"

الفاظ کا یہ امیج اور تخلیقی عمل کی یہ تمثیل ایک داستان سے مشابہ معلوم ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی روزن کی زندگی میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے جس سے اس کی ذات میں ایک خلا سا پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اس کے نسلی اور عصری تاثرات امنڈتے ہیں اور اس کے ذہن میں جذبات کا ایک طوفان پیدا

کر دیتے ہیں طوفان کے نتیجہ میں گرد و دھند کی ایک باریک سی تہہ اس کے اور زندگی کے درمیان آکھڑی ہوتی ہے اور اپنا دم رکتا ہوا محسوس کرتا ہے، اب دو صورتیں ہیں جو دو مختلف قسم کے لوگ اپناتے ہیں یعنی پہلی کہ ایک عام شخص تو اس کے دھند یا گرد کو اپنے سیلِ رواں سے دور کر دے گا اور دوسرا شخص جو تخلیق کار ہوگا وہ اس کو اپنے تخلیقی عمل کی بھٹی میں کندن بنائے گا۔ اور پھر یہ کندن لفظ یا امیج کی صورت میں اُبھر کر سامنے آئے گا جس سے اُبھرنے والی تصویر تخلیق کار کے اندرونی اثرات کا جائزہ لینے میں مدد دے گی۔

مولانا آزاد نے لفظ کے امیج میں ڈھال کر، جس کسی بھی تصویر کو پیش کیا وہ واضح طور پر نقاد کے ہاتھوں سے گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ فقط اس لئے کہ اب الفاظ کا امیج یا سایہ تخلیقی عمل کا محرک ان کے سامنے ہے، وہ جس طرح چاہیں اُسے ڈھال سکتے ہیں۔

آہستہ آہستہ آزاد کے اندر کا تخلیقی انسان خارجی تخلیقی انسان پر حاوی ہوتا چلا گیا اور آزاد نے عالمِ وارفتگی میں قدم رکھا یہ بے خودی کا دور تھا۔ اسے پاگل پن یا دیوانگی نہیں کہا جا سکتا۔ عالمِ وارفتگی اصل میں انسان کی خارجیت پر داخلیت کا عبور ہے۔ آزاد نے جب یہ پل عبور کر لیا تو وہ بذریعہ تحریر ان باتوں کو صفحۂ قرطاس پر پھیلانے لگے جو ان کے شعور سے تحت الشعور کی منازل طے کر چکی تھیں اور وارفتگی کے دور کے نوے رسالے آزاد کی آزادہ روی کے شاہد

دامن میں۔

میرے خیال میں آزاد کے تخلیقی عمل کا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے کیونکہ آزاد نے اسی دور میں خارجیت سے بے بہرہ ہو کر جو زبان استعمال کی ہے وہ آزاد پر خصوصی روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے واقعات اور نئے پہلو سامنے آتے ہیں جو قابلِ غور ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ آزاد نے عالمِ دار و گیر میں بھی قلم کو اپنا رفیق سمجھا شاید دنیا میں کسی ادیب کا یہ حال نہ ہوا ہو گا کہ اس نے ایسی نازک حالت میں بھی قلم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا، گو یہ بات درست ہے کہ آزاد کی زندگی کے بیس برس، جو اصل میں تصنیف و تالیف کے لئے اشد ضروری تھے ضائع ہو گئے لیکن جو ادب انھوں نے اس دور میں تخلیق کیا وہ بھی ادب کا ایک خزینہ ہے آزاد ان تخلیقات میں جسے چند کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مسودات و مخطوطات میں تحریر کانٹ چھانٹ سے مبرا ہے۔ چار، چار، پانچ، پانچ رنگوں کی سیاہی انتہائی نفاست سے استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات پورے پورے واقعات انتہائی تسلسل سے بیان کرتے ہیں اور کبھی اس خارجیت پر آزاد کی داخلیت حاوی ہو جاتی ہے اور تب ہی ان کی شخصیت فن کے ساتھ تخلیق کے مراحل طے کرتی ہے کبھی کبھی لکھتے لکھتے بیک بھی جاتے ہیں اور عموماً انگریزوں کو گالیاں بھی لکھ ڈالتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ایک غیر مطبوعہ عالمِ دار و گیر کے رسالے کا اقتباس پیش کرتا ہوں اس رسالے کا نام "دیا بکھا" ہے

"۔۔۔۔ اب جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے۔ خدا کسی کو نصیب نہ کرے بیٹے سے کل روپیہ اور گھر کا سامان چھنوا کر میرے دشمنوں کو دلوا دیا۔ مجھے ایک اکیلے گھر میں بیٹھا دیا ہے۔ وہ جو چاہے سو میرا حال کرے۔ دو وقت روٹی جیسے کسی کو بھیک مانگنے تو دیتا ہے۔ آ کر دے جاتا ہے بیٹا کہتا ہے: معلوم نہ ہونے دو کہ ہم رہتے کہاں ہیں؟ وہ روٹی نہ دے تو مجھے دروازوں پر مانگنے کے سوا اور کیا۔ ؟ مانگتا مانگتا ایک دن اس دروازے پر جا نکلوں گا۔ ایک دن۔ ہائے۔ کوئی ہماری داد کو نہیں پہنچتا حاکم کر رہے ہیں۔ کون۔ ؟ انگریز۔ وہ اللہ کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ خاص و عام کو دل کے زور سے ہمارے حکم میں کر دو۔۔۔"

یہ آزاد کی نجی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہاں پر اُن کے تحت الشعور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہاں پر بحث نہیں کریں گے بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آزاد کے ذہن کی تخلیقی پرواز کس آسمان پر محوِ پرواز ہے۔ اس مختصر سے اقتباس نے آزاد کی مجبوریوں کی عکاسی کی ہے۔ وہ اس وقت شاید خالص داخلیت کی بجائے خارجیت اور داخلیت کا سنگم پیدا کر رہے ہیں جس میں روانی ہے عمل اور ردِ عمل ہے اور سب سے مکمل تسلسل ہے۔

یہاں پر آزاد نے بحیثیت تخلیق کار ماضی سے قوت اخذ کی ہے اور اُسے حال کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اور اس کا مستقبل سے رشتہ جوڑ دیا ہے جو تا ابد آزاد

کے تخلیقی عمل کے باعث نئے نئے موڑ کا شمار ہے گا۔ فن اور تخلیق کا جو سنگم آزاد نے تنقید کے زمانے میں پیش کیا۔ وہ بھی ماضی اور مستقبل کا سنگم تھا۔ دریا اور آبشار کا سنگم جس کے سہارے دریا جاگتے ہیں گویا اب بحث کو سمیٹتے ہوئے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ بھی ایک قاری کا کردار ادا کر رہا ہے۔ زمانہ جو صاحب بصیرت ناقد کا وہ اجتماعی روپ ہے جو کافی عرصہ گزرنے کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کے وجود میں آنے کے پچاس یا سو برس بعد قاری کا اجتماعی ذہن جو حکم صادر کرتا ہے وہ عموماً درست تسلیم ہوتا ہے۔ اس اجتماعی ذہن کا نام "زمانہ" ہے۔ چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو تخلیقات اپنے زمانے میں مقبول اور شہرت عام رکھتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد فراموش ہو جاتی ہیں۔ گویا انھیں اجتماعی ذہن یعنی زمانے نے فراموش کر دیا۔ اب صرف وہی تخلیقات باقی رہ جاتی ہیں اور ابدی شہرت پاتی ہیں جن میں دائمی عناصر موجود ہوتے ہیں۔ گویا اجتماعی ذہن یا زمانے نے اس تخلیقی عمل کو فراموش نہیں کیا۔

میرا خیال ہے کہ اب آزاد کی شہرت، فن اور تخلیقی عمل کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ بس یہی کافی ہے کہ زمانہ ان کے تخلیقی عمل کو فراموش نہیں کر سکتا۔

آزاد کی تصانیف

محمد حسین آزاد نے اپنی زندگی میں تقریباً تین سو مقالے اور ایک سو دس سے زیادہ درسی اور ادبی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ۹ ، ادبی، سیاسی اور ذاتی حالات کی تصانیف عالم و ارفتگی کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ آزاد کی درسی کتابوں کو بھی عظیم شہرت ملی۔ اسی سلسلے میں قصص ہند وغیرہ کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں آزاد کی مشہور کتابوں کے بارے میں مختصر طور پر ایک تعارف نامہ دیا جا رہا ہے جس سے آزاد کی تصانیف کا ادبی اور سماجی مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔

آغا سلمان باقر

آبِ حیات

۱۸۸۰ء میں پہلی بار وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب پانچ ادوار پر مشتمل ہے۔ آبِ حیات کو بنیادی طور پر کلاسیکی شاعروں کا جدید تذکرہ شمار کیا جاتا

ہے۔ اس سے قبل کے تذکروں میں تنقید، حالات اور شاعری کے تجزیہ کا آبِ حیات جیسا متوازن انداز نہیں ہوتا تھا۔ اس کتاب میں انسانوریت، ادبیت، اور تاثراتی نثر ہے۔ انشا پردازی میں یہ کتاب اُردو ادب میں لازوال حیثیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے پیچھے بیس برس کی محنت کارفرما ہے۔ آبِ حیات کے آغاز میں آزاد نے اُردو کی تاریخ کا ایک باقاعدہ نظریہ پیش کیا ہے اور اُس کے فوراً بعد اُردو کی نثر اور نظم کی تاریخ ہے۔ آبِ حیات کو اپنی زبان، شائستگی اور لطافت کے باعث نثر کی الہامی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

۱۹۸۰ء آبِ حیات کی صدی ہے۔

نیرنگِ خیال

۱۸۸۰ء میں پہلی بار نیرنگِ خیال کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں نیرنگِ خیال کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ نیرنگ خیال کی اشاعت سے اُردو انشا پردازی میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا آغاز ہوا۔ نیرنگِ خیال کے مضامین کو سرسید نے اُردو کا پہلا انشائیہ قرار دیا۔ نیرنگِ خیال کا اسلوب اپنے وقت میں جدید ترین اسلوب قرار پایا۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ یہ کتاب اشاعت کے فوراً بعد نصاب میں داخل کر لی گئی۔ نیرنگِ خیال تمثیل اور ثقافت کا حسین سنگم ہے۔ اس کا ایک مضمون "شہرت عام اور بقائے دوام کا بازار"

اُردو ادب کا عظیم الشان انشائیہ کہلانے کا حقدار ہے۔

۱۹۸۰ء نیرنگِ خیال کی صدی سالگرہ ہے۔

سخن دانِ فارس

۱۸۸۲ء میں سخن دانِ فارس کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں دوسرا حصہ شائع ہوا۔ یہ اُن لیکچروں کا مجموعہ ہے جو آزاد نے اُردو، فارسی اور سنسکرت کے حوالے سے زبان کی ترقی اور بناوٹ کے بارے میں ٹریننگ کالج لاہور میں دیئے۔

یہ علمی اور ادبی لیکچر آج بھی اُردو کے ماخذ شمار کئے جاتے ہیں۔ آزاد کی زبان دانی اور اُس کے تجزیے کا بہترین نتیجہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔ آزاد نے فارسی نظم اور نثر میں اُردو کے پیوند کے بارے میں ایسی رائے، ان لیکچروں میں پیش کی ہے، جو آج بھی زبان کے طالب علم کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

لسانیات کا تقابلی جائزہ سخندان فارسی میں ہے، وہ ادب کا سرمایہ حیات ہے۔ ہندایرانی تقابلی لسانیات پر بحث کرنے سے پہلے آزاد نے لغات اور زبانوں کی فلسفیانہ تحقیقات کے اصول بیان کئے ہیں۔ اور اس علم کے بارے میں قدیم یونانی نظریے پر اپنے خیالات کی روشنی میں بحث کی ہے۔ آزاد نے اس کتاب میں جو خاکے پیش کئے ہیں اُن کا تعلق ایسے تمام صوتی رجحانات سے ہے جو زبان اُردو میں داخل ہوئے

ایک طرح سے آزاد نے سخنداں فارس میں زبان کے ارتقاء کا جدید ترین نظریہ پیش کیا جو آج کسی محقق کے انتظار میں ہے۔

نگارستانِ فارس

۱۹۲۲ء میں نگارستان فارس آغا محمد طاہر نے شایع کی۔ 'نگارستانِ فارس' آبِ حیات کی طرح فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب آزاد کے فارسی سے شغف کا وہ مُرقّع ہے جو ایک مدت سے توجہ کا طالب ہے۔ نگارستانِ فارس کا تنقیدی انداز اُس کا خصوصی پہلو ہے۔

نگارستان فارس بھی اپنے اسلوب کے باعث اور فارسی شعراء کے حوالے سے ایک خاص انداز کا تذکرہ ہے۔

دربارِ اکبری

۱۸۹۸ء میں دربارِ اکبری اُس وقت شائع ہوئی جب آزاد ہوش و خرد سے آزاد، عالمِ وارفتگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس کی اشاعت کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مولانا ممتاز علی نے آزاد کی وارفتگی سے فائدہ اُٹھا کر اسے اپنے نام سے شائع کر لیا۔ مگر بعد میں یہ ثابت ہو گیا، کیونکہ اس کتاب کا قلمی مسودہ آزاد کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ دوسرے ایڈیشن پر آزاد کا

نام شائع ہوا۔

دربارِ اکبری آزاد کی تصانیف میں سب سے طویل کتاب ہے۔ یہ اکبر کے دربار کے حالات اور اُس کے زمانے کی ثقافتی تصویر ہے۔ جو آزاد کے اسلوبِ خاص کی ایک خوبصورت اور لازوال شکل ہے۔

آزاد کی اس تصنیف میں غنائیت نمایاں ہے۔ تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ آزاد نے بزم اور رزم کا بھی خیال رکھا ہے۔ ہم دربارِ اکبری کو ایک تاریخی ناول بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اس میں ناولیت نمایاں نہیں ہے۔ مگر زبان اور اسلوب میں منظر نگاری اور مکالمے ڈرامے کی شکل اختیار کر گئے ہیں جن کی وجہ سے اس کی تاریخی حیثیت پر اثر پڑا ہے۔ آزاد نے واقعات کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اُردو ادب میں آفاقی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

دیوانِ ذوق

۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ جب آزاد عالمِ ہوش کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ آزاد کو اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں آزاد کو دہلی سے ہجرت کرنا پڑی اور اچانک گھر سے نکلنا پڑا تو وہ صرف اپنے اُستاد کا کلام لے کر نکلے۔

دیوانِ ذوق مرتب کرنے کا خیال آزاد کو ۱۸۵۹ء سے تھا۔ اُستاد ذوق

ی شخصیت اور فن اور شاعرانہ معرکوں کا جو خاکہ آزاد نے اس کتاب میں کھینچا ہے۔ وہ آج بھی اُستاد ذوق کی شخصیت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ غالب پرستوں نے دیوانِ ذوق کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور اُسے آزاد کی اختراع قرار دیا۔

نظمِ آزاد

۱۸۹۷ء میں آغا محمد ابراہیم نے آزاد کی وہ تمام نظمیں پہلی مرتبہ شائع کیں، جو اُنھوں نے اکثر و بیشتر کہیں تھیں۔ اِن میں وہ نظمیں بھی تھیں۔ جو انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں میں جدید انداز میں کہی گئیں۔

نظمِ آزاد کے ابتدا میں دو لیکچر دیباچہ کے طور پر شامل ہیں۔ اِن لیکچروں میں آزاد نے جدید شاعری کے مقصد اور ضرورت کو واضح کیا ہے۔ یہ وہی ترقی یافتہ تجاویز ہیں۔ جو آزاد آبِ حیات میں پیش کر چکے تھے۔ آزاد کی ایک نظم "شبِ قدر" نے علامہ اقبال پر ایسا اثر کیا کہ وہ "سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی" کہہ کر اُسے زندہ جاوید بنا گئے۔

آزاد کی اِن نظموں میں زبان کو اُجالنے اور نکھارنے کا بہترین تجربہ نمایاں ہے۔ وہ عشق و عاشقی سے الگ شاعری کے حامی تھے۔ جس کی بنیاد برِ صغیر میں اُنھیں رکھنے اور قائم کرنے کا اعزاز ۱۸۷۴ء میں حاصل ہوا۔

نظمِ آزاد اُردو ادب کا وہ پہلا شعری مجموعہ ہے، جس میں جدید نظم کا واضح اور متحرک تصور پیش کیا گیا ہے۔

خمکدۂ آزاد

خمکدۂ آزاد میں غزلیات شامل ہیں جن کی تعداد ۶۳ ہے، اور ۱۰ قصائد بھی ہیں۔ آزاد کی غزلیں رُومان پرور اور گہرے تجربے کی حامل ہیں۔ اُن میں فرد کی ذات ایک طویل مشاہدے کی مرہونِ منت نظر آتی ہے۔ آزاد نے اکثر غزلیں سنگلاخ زمینوں میں کہی ہیں۔ آزاد کے اندازِ غزل پر ذوق اور عیش کے اثرات نمایاں ہیں۔ کیونکہ آزاد انہی کے شاگرد تھے۔

آزاد کے قصیدوں میں غزل کی نسبت زیادہ روانی، سلاست اور آہنگ ہے۔ قصیدوں میں تشبیب اور گریز اُن کی زبان دانی اور قادر الکلامی کا خوبصورت تاثر پیش کرتا ہے۔

آزاد کی بعض دوسری تصانیف

۱۔ اُردو کی پہلی کتاب (قدیم سلسلہ)

۲۔ اُردو کی دوسری کتاب (قدیم سلسلہ)

۳۔ فارسی کی پہلی کتاب (سنہ تصنیف ۱۸۷۶ء)

۴۔ فارسی کی دوسری کتاب (سنہ تصنیف ۱۸۶۰ء)

۵۔ اُردو کی پہلی کتاب ۱۸۶۷ء

۶۔ اُردو کی دوسری کتاب ۱۸۶۷ء

۷۔ اُردو کی تیسری کتاب ۱۸۶۷ء

۸۔ اُردو کی چوتھی کتاب ۱۸۶۷ء

۹۔ قصصِ ہند ۱۸۶۹ء — اشاعت ۱۸۷۰ء

۱۰۔ قصصِ ہند ۱۸۶۹ء — اشاعت ۱۸۸۳ء

۱۱۔ جامع القواعد ۱۸۸۴ء

۱۲۔ آئینہ صحت ۱۸۶۱ء

۱۳۔ نصیحت کا کرن پھول ۱۸۶۴ء

۱۴۔ فارسی قواعد ۱۸۶۹ء (دو سو روپے کا انعام)

۱۵۔ اُردو قواعد

۱۶۔ قنا۔ پارسی (تصنیف ۱۸۸۰ء — اشاعت ۱۹۰۶ء)

۱۷۔ آموزگارِ پارسی مطبوعہ ۱۹۲۴ء

۱۸۔ قواعد فارسی ۱۸۷۹ء

۱۹۔ کائنات عرب ۱۹۲۲ء

۲۰۔ تذکرۂ علماء ۱۹۲۲ء

۲۱۔ حکایاتِ آزاد مطبوعہ ۱۹۶۱ء

۲۲۔ شہزادہ ابراہیم کی کہانی ۱۹۶۱ء

۲۳۔ لغتِ آزاد ۱۹۲۴ء

۲۴۔ مقالاتِ آزاد حصہ اوّل۔ مرتبہ آغا محمد باقر ۱۹۶۸ء

۲۵۔ مقالاتِ آزاد حصہ دوم۔ مرتبہ آغا محمد باقر، آغا کلمان باقر ۱۹۶۹ء

۲۶۔ مقالاتِ آزاد حصہ سوم۔ مرتبہ آغا سلمان باقر (زیرِ طبع)

حوالہ جات

اور

تالیقات

۱۔ حیاتِ جاوید — از مولانا الطاف حسین حالی — ص ۳۳

۲۔ آبِ حیات — از محمد حسین آزاد — ص ۴۲۶

۳۔ دیوانِ ذوق — محمد حسین آزاد — ص ۲۷

۴۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور آزاد کے تاثرات کا جو انداز اُن کی عالم وارفتگی کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، وہ اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے۔ اس سلسلے میں میری کتاب دیکھیے: "محمد حسین آزاد کا عالم وارفتگی" (سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۰ء)

۵۔ مرحوم دہلی کالج — ص ۴۵

۶۔ دیوانِ ذوق — ص ۴۳

۷۔ نقوشِ شخصیات نمبر — از آغا محمد باقر — ص

۸۔ **آغا محمد اشرف**: ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۲ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ آغا محمد اشرف آزاد کے پوتے تھے اور آغا محمد ابراہیم کے بیٹے

تھے۔ وہ فارسی میں ایم۔اے تھے۔ ڈیرہ دون کالج میں وہ استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے ۱۹۴۷ء میں انگلستان چلے گئے اور وہاں ایک کالج میں اُردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے انھیں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔ اسی دوران میں وہ بی۔بی۔سی لندن میں اُردو سروس کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ لوگ اُن کے منہ سے "آداب عرض" پروگرام سننے کو بے قرار رہتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ نے آغا اشرف کو "گولڈن ٹائیس" کا خطاب دیا تھا۔ وہ کینسر کے مریض بن گئے اور لاہور میں انتقال کیا۔ مومن پورہ میں اُن کی قبر اپنے بھائی آغا محمد اسمٰعیل کے پہلو میں واقع ہے۔ اُن کی مشہور تصنیف "سنٹرل ایشیا کا سیاسی مشن" ہے۔

۹۔ انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت از آغا محمد اشرف۔

۱۰۔ **آغا محمد باقر**: ۱۹۰۷ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ آغا محمد باقر آزاد کے سب سے پیارے اور چہیتے پوتے تھے۔ آزاد نے اُن کا نام اپنے والد کے نام پر محمد باقر رکھا تھا۔ آغا محمد باقر کی پہلی تصنیف ۱۹۳۰ء میں "تاریخ نظم و نثر اُردو ادب" شائع ہوئی۔ اُس کے بعد "بیانِ غالب"۔ آغا محمد باقر

ایم اے فارسی اور اردو تھے اور بی ایڈ بھی تھے۔ آغا محمد باقر کی تصانیف کی فہرست اپنے سب بھائیوں میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ تاریخ نظم و نثر اردو ادب، بیان غالب، نگارشات، مقالات آزاد حصہ اول و دوم اُن کی مشہور تصانیف ہیں۔ وہ دلی کالج میں ۱۹۳۰ء میں پروفیسر مقرر ہوئے اور پھر ۱۹۴۰ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اور آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے قیام پاکستان کے بعد اُن کا تبادلہ لاہور ریڈیو پر ہو گیا۔ وہ لاہور ریڈیو کے پہلے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھے۔ جب اُن کا تبادلہ کراچی ۱۹۵۳ء میں ہوا تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا پھر وہ تصنیف و تالیف اور کاروبار میں منہمک ہو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا جعفریہ کالونی، بندر روڈ پر اُن کی قبر ہے۔ راقم الحروف کے والد تھے۔

۱۱۔ **آغا محمد ابراہیم ابرو**:۔ آزاد کے بیٹے تھے۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ کو دلی میں پیدا ہوئے اور لاہور میں ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء کو وفات پائی۔ وہ عدلیہ سے منسلک تھے۔ آزاد نے اُن کا نام اپنے اُستاد ذوق کے نام پر محمد ابراہیم رکھا۔ وہ اُنھیں پیار سے ابرو کہتے اور اس لئے بھی کہتے کہ کہیں استاد کے نام کی بے حرمتی نہ ہوئے۔ آغا محمد ابراہیم کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔

۱۲۔ کتب خانہ آزاد کے سلسلے میں میرے والد آغا محمد باقر کا ایک تفصیلی مضمون ماہنامہ ادبی دنیا زیر ادارت مولانا صلاح الدین احمد مرحوم ملاحظہ کیجئے نیز دار فنگی کا

آغاز اسی دور میں ہوا تھا۔ اسی حوالے سے آزاد کا نفسیاتی اور تحلیلی تجزیہ تفصیل کے ساتھ میری کتاب "محمد حسین آزاد کا عالم دار فنگی" میں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۳۔ راقم الحروف کا یہ مقالہ روزنامہ امروز لاہور بابت ۵ جنوری ۱۹۵۸ء کو یوم آزاد کے موقع پر ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع ہوا۔

۱۴۔ راقم الحروف کا یہ مقالہ بعنوان "آزاد کا تخلیقی عمل اور فن" روزنامہ امروز بابت ۲۳ فروری ۱۹۶۰ء لاہور میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ مقالہ یوم آزاد کے اجلاس میں زیر صدارت وزیر قانون ایس ایم مسعود پڑھا گیا۔